اورہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے، سمجھے

جلد 6	شمارہ 11	ذی الحجہ 1433ھ	نومبر 2012ء

ماھنامہ

حکمتِ بالغہ

جھنگ

مدیر مسئول : انجینئر مختار فاروقی

مشاورت

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

حافظ مختار احمد گوندل

پروفیسر خلیل الرحمٰن

محمد فیاض عادل فاروقی

مدیر معاون ونگران طباعت: مفتی عطاء الرحمٰن

تزئین وگرافکس: سعد حسن خان

قانونی مشاورت:

محمد سلیم بٹ ایڈووکیٹ، چودھری خالد اشیر ایڈووکیٹ

ترسیل زر بنام: انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ جھنگ

اہل ثروت حضرات کے لیے تاحیات زرتعاون پندرہ ہزار روپے یکمشت

سالانہ زرتعاون: اندورنِ ملک 350 روپے، قیمت فی شمارہ 35 روپے

قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر پاکستان پوسٹ کوڈ 35200

047-7628561-7628361

ای میل: hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ: www.hamditabligh.net ,www.hikmatbaalgha.com

پبلشر: انجینئر مختار فاروقی طابع: محمد فیاض مطبع: سلطان باہو پریس فوارچوک جھنگ صدر

اَلْکَلِمَۃُ الْحِکْمَۃُ ضَآلَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا (ترمذی)

حکمت کی بات بندۂ مومن کی گم شدہ چیز ہے جہاں کہیں بھی وہ اس کو پائے وہی اس کا زیادہ حق دار ہے

مشمولات

1	قرآن مجید کے ساتھ چند لمحات		3
2	حرفِ آرزو	انجینئر مختار فاروقی	5
3	توہین رسالت کیوں سنگین جرم ہے؟		25
4	خودی کی حقیقت(3)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین	42
5	موجودہ اسرائیلی ریاست کا مستقبل؟ اہل علم کی آراء وتاثرات	نذیر یاسین	
	THE HARMAIN ARE US TARGET	Dr. S. Ausaf Saied Vasfi	

قارئین کرام! قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات و احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

یہ رسالہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ نہ ملنے کی صورت میں 6 تاریخ تک دفتر رابطہ فرمائیں (ادارہ)

قرآن مجید

کے ساتھ

چند لمحات

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ رَبَّكَ یَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ

آپ کا ربّ خوب جانتا ہے کہ آپ قیام کیا کرتے ہو

اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ

(کبھی) دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات

وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَكَ

اور ایک جماعت آپ کے ساتھ کے لوگوں میں سے (بھی)

وَ اللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ

اور اللہ تو رات اور دن (حالات) کا اندازہ رکھتا ہے

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَیْكُمْ

اس کو معلوم ہے کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے تو اس نے تم پر مہربانی کی

فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ

پس جتنا آسانی سے ہو سکے (اتنا) قرآن پڑھ لیا کرو

عَلِمَ اَنۡ سَیَکُوۡنُ مِنۡکُمۡ مَّرۡضٰی

اس کو معلوم ہے کہ تم میں بیمار بھی ہوتے ہیں

وَ اٰخَرُوۡنَ یَضۡرِبُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ یَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ

اور بعض اللہ کے فضل (یعنی معاش) کی تلاش میں ملکوں میں سفر کرتے ہیں

وَ اٰخَرُوۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ

اور (بعض) دوسرے اللہ کی راہ میں مصروفِ قتال رہتے ہیں

فَاقۡرَءُوۡا مَا تَیَسَّرَ مِنۡہُ

تو جتنا آسانی سے ہو سکے اتنا پڑھ لیا کرو

وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ

اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو

وَ اَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا

اور اللہ کو نیک (اور خلوصِ نیت سے) قرض دیتے رہو

وَ مَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ

اور جو عمل نیک تم اپنے لیے آگے بھیجو گے

تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ہُوَ خَیۡرًا وَّ اَعۡظَمَ اَجۡرًا

اس کو اللہ کے ہاں پاؤ گے بہتر اور صلے میں بزرگ تر

وَ اسۡتَغۡفِرُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ O

اور اللہ سے بخشش مانگتے رہو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

صدق اللّٰہ العظیم

یَـــارَبِّ لَکَ الۡـحَـمۡـدُ کَـمَـــا یَـنۡبَـغِـیۡ

لِـجَلَالِ وَجۡھِکَ وَ عَـظِیۡـمِ سُـلۡـطَـانِکَ

اے میرے پروردگار! تیرے ہی لیے ہے حمد و شکر، جیسے شایانِ شان ہے تیری جلیل ذات اور عظیم سلطنت کے

ع ہے جرمِ ضعیفی کی سزا ''توہین رسالت''

وھن ـــــ توہین رسالت
اور کرنے کا کام

انجینئر مختار فاروقی

یہ تحریر پہلے بھی حکمت بالغہ کے صفحات میں شائع ہوئی تھی مضمون کی
اہمیت کے پیشِ نظر اب ذرا سی کمی بیشی کے ساتھ دوبارہ پیش خدمت ہے۔

دنیا میں آج مسلمانوں کی تعداد 150 کروڑ کے قریب ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ہر پانچواں انسان مسلمان ہے اور مسلمانوں کے پاس وسائل کی بھی فراوانی ہے۔ 60 مسلمان ممالک ہیں اور ان کے پاس دنیا کا بہترین زرعی علاقہ ہے، تیل کی پیداوار کے ذخائر ہیں، اعلیٰ ترین افرادی قوت ہے، زرعی اجناس اور پھلوں سے مالا مال مارکیٹیں ہیں ـــــ مگر دنیا بھر میں نہ عزت ہے نہ وقار، نہ داخلی استحکام ہے نہ خارجی امن، مسلمان ہر جگہ اور ہر لحاظ سے کسمپرسی اور محکومیت کا شکار ہیں۔ عوام کیا خواص بھی عالمی طاقتوں اور اُن کے در پردہ صہیونی آقاؤں کے آگے دست بستہ بے دام غلام کی حیثیت سے کھڑے ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ محکومیت اور 'مسکنت' کی حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہم عملاً امریکہ اور مغربی ممالک کے غلام بن چکے ہیں۔

اس سارے قضیئے کی بنیادی وجہ ہم مسلمانوں کا مجموعی طور پر دین کو چھوڑ دینا ہے اور قرآن مجید سے بے اعتنائی برتنا ہے۔ ایک حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا اے مسلمانو! تم کثرت میں ہونے کے باوجود بے وقعت ہو جاؤ گے اور تمہاری حالت 'غثاء السیل' یعنی سیلابی ریلے کے اوپر والی جھاگ اور خس و خاشاک سے زیادہ نہیں ہوگی۔ صحابہ

کرام j کوتشویش لاحق ہوئی سوال ہوا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ کیا مسلمانوں کی یہ حالت 'عددی قلّت' کی وجہ سے ہوگی؟ ارشاد ہوا نہیں 'بَلْ اَنْتُمْ یَوْمَئِذٍ کَثِیْر' (بلکہ تم اس وقت تعداد میں بہت زیادہ ہوگے' جیسے آج کل ہیں) پھر اس ذلت و رسوائی کی وجہ؟ ارشاد ہوا کہ تمہارے اندر ایک بیماری پیدا ہو جائے گی اس کا نام ہے 'وھن'۔ عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرمایئے کہ یہ 'وھن' کیا بیماری ہے؟ ارشاد ہوا: حُبُّ الدُّنْیَا وَ کَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ

''دنیا کی محبت (میں گرفتار ہونا) اور موت سے (اپنے اعمال سیّئہ کے باعث) کراہیت''

آج ہم مسلمانوں کی عمومی ذلت و رسوائی کا مشاہدہ کریں تو سر کی آنکھوں سے یہ حقیقت دیکھی جاسکتی ہے اور ہر عام و خاص کو اس ذلت و رسوائی سے سابقہ ہے۔ غور کریں تو محسوس ہوگا کہ یقیناً آج مجموعی طور پر مسلمانوں میں یہ 'وھن' کی بیماری نہ صرف پیدا ہو چکی ہے بلکہ جسد ملّی کے ریشے ریشے اور خلیے خلیے میں سرایت کر چکی ہے اور بالعموم ہم مسلمان عالمی سطح پر بے وقعت، بے اختیار اور عالمی طاقتوں کے رحم و کرم پر آس لگائے مستقبل کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

دنیا میں انبیاء کرام علیہم السلام کے مبارک زمانوں (جب اہل ایمان کو غلبہ حاصل ہوا اور نیکی کا دور دورہ ہو گیا حق غالب ہو گیا اور باطل بھاگ گیا) کے علاوہ ہمیشہ باطل کا غلبہ اور طاقت کا قانون رائج رہا ہے، MIGHT IS RIGHT ـــــ یا 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کے اُصول کی فرماں روائی رہی ہے اور آج بھی علم کے شہرہ، ترقی، وسائل، شعور و آگہی کی فراوانی کے باوجود عالمی سطح پر یہی 'جنگل کا قانون' رائج ہے۔ مسلمان دین سے بے وفائی کے باعث بے وقعت ہوئے تو 'عالم کفر' نے مسلمانوں پر چڑھائی کر دی اور ہمارے اُصول، علم، تحقیق، ترقی، ثقافت، آرٹ ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس صورت حال میں دو صدیاں بیت چکی ہیں۔ تو آج ہر جگہ مغرب کی جارحانہ اور ظالمانہ کاروائیوں اور بے اُصولیوں کے باعث 'کھرے' کو 'کھوٹا' اور جھوٹ کو سچ بنایا گیا ہے اور میڈیا کے ذریعے 'زہر' کو 'آبِ حیات' بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

گزشتہ ساٹھ سالوں میں مسلمانوں نے جسمانی طور پر (PHYSICALLY) تو اقوام یورپ اور صہیونی طاقتوں سے آزادی حاصل کر لی ہے اور ساٹھ کے لگ بھگ مسلمان ملک آزاد ہیں مگر ذہنی و فکری غلامی ابھی اپنی جگہ قائم ہے بلکہ بعض لحاظ سے گہری ہوتی جا رہی ہے۔

محکومی میں کسی قوم کے افراد کو غلام بنالیا جاتا ہے تو اس قوم کی عزت نفس اور نظریات و افکار کو بھی پاؤں تلے روند دیا جاتا ہے اور محکوموں کی چیخ و پکار حاکموں اور وقت کے فرعونوں کے کانوں پر کوئی ارتعاش پیدا نہیں کر سکتی۔ یہی حال آج ہم مسلمانوں کا ہے۔ ہم مسلمان تو مغربی آقاؤں کی غلامی کر ہی رہے ہیں ہمارے ٹیکس ہمارے آقاؤں کے مسلط کردہ حاکموں کی جیبیں بھرتے ہیں اُن کے لئے عیاشی کا سامان فراہم کرتے ہیں اور یہ حکمران اپنی قوم کے جذبات کی عکاسی کی بجائے عالمی طاقتوں کو خوش کر کے اپنی حکمرانی کے دن طویل کرنے کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ آج عالمی طاقتیں ہماری عزتِ نفس کو کچل کر ہمارے افکار و نظریات کو جامد، دقیانوسی، پرانے اور پتھر کے زمانے کی باتیں (اساطیر الاولین) باور کرانے کے درپے ہیں بلکہ ہماری محبوب شخصیات اور جان سے عزیز پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی بے حرمتی اور توہین پر اُتر آئے ہیں۔ گزشتہ کئی سالوں سے یہ عمل بھی مسلسل جاری ہے اور ـــــ ہم محکوموں کی آہ و پکار اور احتجاج بھی ـــــ مگر وقت کے فرعونوں کو اس سے کیا غرض۔ اب اس سے آگے بڑھ کر اقوام مغرب نے اور اس کے سرغنہ امریکہ نے اپنی سرزمین سے یہ ناپاک جسارت بھی کی کہ (1) وہاں خاکم بدہن حضرت محمد ﷺ کے کارٹون بنانے کے مکروہ عمل کا مقابلہ منعقد کرایا۔ (2) نائن الیون کے دس سالہ یادگاری دن کے موقع پر امریکہ کے ایک پادری نے قرآن پاک کو جلا دیا۔ اور (3) اب 2012ء میں حضرت محمد ﷺ کی ذاتی اور شخصی توہین میں ایک فلم بنا کر (خاکم بدہن) انتہائی توہین آمیز جملے اس میں کہے گئے۔ اس جانکاہ سانحہ پر اِدھر احتجاج جاری ہے اور اُدھر بے حسی کا عالم ہے اور ہمارے ملک کے اندر دشمن کے چھپے ایجنٹ آزادئ رائے کے نام سے ان شیطانی اعمال کا جواز پیش کر رہے ہیں۔ کاش یہ دن دیکھنے کے لئے ہم زندہ نہ رہے ہوتے!۔

دنیا میں یہ جاری اُصول اگر ہمیں سمجھ میں آجائے کہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اور اپنی 'وھن' کی بیماری کا احساس بھی ہو جائے تو آج مغرب کی دلیری اور ہماری بے عزتی نہیں ہمارے پیغمبر ﷺ کی توہین کا ارتکاب ہمیں احساس دلائے گا ـــــ کہ 'وھن' سے ہی 'توہین' کا لفظ بنا ہے ہماری خطاؤں لغزشوں اور بے عملیوں سے ہی دشمن کو شہ ملی ہے اور وہ ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی توہین کا مرتکب ہو رہا ہے۔

یقین کیجیے ـــــ احتجاج کی صدا بلند رکھنا ہمارا فرض ہے اور دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا ہمارا ایمان ـــــ مگر مغربی اقوام کے ذہن کا خناس (اور فرعونیت) کبھی احتجاج کی زبان کو اہمیت نہیں دے گا۔ ہمیں ـــــ بیدار ہونا چاہیے اور متحد ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے ـــــ ملک خداداد پاکستان میں اسلام کے عادلانہ نظام کا نفاذ ضروری ہے اگر یہاں ـــــ اگلے الیکشن میں حضرت محمد ﷺ کے سچے اُمتی اور حقیقی غلامانِ مصطفیٰ اقتدار میں آجائیں تو دیکھئے یہ توہین آمیز کاروائیاں اور مسلمانوں کا دل جلانے والے اقدامات کا راتوں رات خاتمہ ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے وہ ہمیں سچی توبہ کرنے اور حضرت محمد ﷺ کا سچا اُمتی بننے کی ہمت اور شوق دے۔ بقول اقبال ؎

تڑپنے ، پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰ h ، سوزِ صدیق h دے

اگر یہ دولت ہمیں میسر آجائے تو پھر صہیونیت کو سانپ سونگھ جائے گا، مغربی بے غیرت اور بے حیاء اقوام کو لباس یاد آجائے گا اور اسلام، پیغمبر اسلام (حضرت محمد ﷺ) اور مسلمان کا نام ادب سے (باوضو ہو کر) لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ہمارا ماضی، ہمارے معتقدات، ہماری ثقافت، ARTS، ہماری محبوب شخصیات دنیا میں پہچانی جانے لگیں گی اور آج کی مادر پدر آزاد انسانیت کو اللہ، آخرت اور وحی کے الفاظ ذہن کے کسی گوشے سے اُبھر کر زبان پر آجائیں گے اگر ہم اس جاری احتجاج کے ساتھ درون بینی (INWARD LOOKING) کا اہتمام کریں اور ایک حقیقی اسلامی ریاست دنیا میں بنا دیں تو 'خاکے بند کرو' کے مطالبہ کی بجائے اسلام کے غلبے کی جدوجہد کا راستہ یقیناً زیادہ صحیح، مختصر اور آسان راستہ ثابت ہوگا۔ و ما ذالك على الله العزيز

توہینِ رسالت
کیوں سنگین جرم ہے؟

انجینئر مختار فاروقی

یہ تحریر چند سال پہلے بھی حکمت بالغہ کے صفحات میں شائع ہوئی تھی مضمون کی
اہمیت کے پیش نظر اب ذرا سی کمی بیشی کے ساتھ دوبارہ پیش خدمت ہے۔

مغربی پریس میں پیغمبر آخرالزمان حضرت محمد ﷺ کے توہین آمیز خاکوں کی اشاعت اور توہین آمیز فلم پر حالیہ دنوں میں تمام عالم اسلام میں جس طرح کا ردِّعمل سامنے آیا ہے اور شدید ترین احتجاج ہوا ہے اور ابھی جاری ہے وہ حالیہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس دوران مسلمان عوام نے جس طرح کے جذبات کا اظہار کیا ہے وہ ان نعروں اور بینرز کی عبارات سے ظاہر ہے جو احتجاجی مظاہروں اور جلوسوں میں سامنے آئے ہیں، جن میں سے چند بطور نمونہ یہ ہیں:

☆ توہین رسالت سنگین جرم ہے۔
☆ توہین رسالت کا مرتکب جہنمی ہے۔
☆ توہین رسالت کا مرتکب واجب القتل ہے۔
☆ خاکوں کی اشاعت کرنے والوں کا علاج غازی علم دین شہید جیسے مجاہد ہیں۔
☆ توہین رسالت یہودیوں کی سازش ہے۔
☆ خاکوں کی اشاعت مسلمانوں کی غیرت ایمانی کا چیلنج ہے۔
☆ توہین آمیز خاکوں کی اشاعت صلیبی جنگوں کا آغاز ہے۔

یہ نعرے اور اسی طرح کے جذبات کے اظہار کے دیگر الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے

نزدیک حضرت محمد ﷺ ایسی واجب الاحترام اور رفیع المرتبت ہستی ہیں کہ ان کی توہین کا سوچنا بھی جرم ہے اور اپنے محبوب پیغمبر ﷺ کے دفاع کے لئے جان کا نذرانہ پیش کرنا زندگی کی سب سے بڑی آرزو اور سعادت ہے اور ہر خاص و عام مسلمان اس کے لئے بے تاب و بے چین ہے۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کونسی خاص بات ہے کہ جس کی وجہ سے حضرت محمد ﷺ کی بارگاہ میں سوئے ادب بھی جرم بن جاتا ہے اور ناقابل معافی کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سوال کا جواب شاید ہر مسلمان کے دل میں تو ہو مگر اس کا کچھ معین الفاظ میں ڈھل کر زبان پر آ جانا اتنا عام بھی نہیں اور شاید اتنا آسان بھی نہیں۔

ان سطور میں اس بات کی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے کہ نوعِ انسانی کے لیے حضرت محمد ﷺ کس طرح واجب الاحترام ہیں اور کسی دریدہ دہن کی زہر افشانی صرف مسلمانوں اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف ہی نہیں بلکہ انسانیت کے خلاف ہوتی ہے اور ایسی حرکتیں کس طرح انسانیت کے خلاف کسی خبیث روح کا ظہور اور کسی شیطانی الہام کا مظہر اور کسی گندے ذہن کی گندی سوچ کا مرقّع بن کر شعورِ انسانی پر ایک سیاہ داغ چھوڑ جاتی ہے جس کے اثرات نسلوں کو متاثر کر جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایسی ناپاک جسارتیں جو بظاہر معصوم ہی محسوس ہوں حقیقتاً سنگین نوعیت کا جرم اور CAPITAL PUNISHMENT کی سزاوار سمجھی جاتی ہیں۔

ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں تو یہ سوچ صرف مسلمانوں کی اپنے پیغمبر ہی کے بارے میں نہیں ہے بلکہ تمام بانیانِ مذاہب جو حقیقتاً نہایت پاک سیرت اور اخلاقی، عملی اور نجی زندگی کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ معیار کے انسان تھے، ان سب کے بارے میں ان کے پیروکار یہی سوچ رکھتے ہیں کہ ان کی توہین سنگین جرم ہے۔ اور یہ بات انسانی لاشعور کا حصہ ہے کہ ان پیغمبر حضرات علیہم السلام کی توہین پر ان کے پیروکاروں کو ویسا ہی اختیار اور حق مل جاتا ہے جیسا کہ آج دنیا کی خود ساختہ عالمی طاقت امریکہ کو نشۂ اقتدار میں اپنے اقتدار کے لئے خطرہ بننے والے کسی فرد، گروہ یا ملک پر بغیر پیشگی اطلاع کارروائی اور حملہ کا جواز حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی کارروائی آج کی اصطلاح میں ''دہشت گردی'' ہے اور یہی اصطلاح ٹھیک ان توہین آمیز خاکوں پر بھی صادق آتی ہے جس سے مسلمانوں میں غازی علم دین شہیدؒ کا کردار ادا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں

بھی ایسے دہشت گردوں سے نمٹنے کے لئے کسی پیشگی اطلاع اور وارننگ کی ہرگز ضرورت نہیں رہتی۔

تفصیل میں جانے سے پہلے ایک بات اور بطور تمہید سامنے رکھنا ضروری ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی عظمت اور مقام کا ادراک مغربی دانشوروں کو تو کما حقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی مقامِ مصطفےٰ ﷺ کا تصور دھندلا سا گیا ہے اور ہم بھی یقین وایقان اور CONVICTION کی دولت سے تہی دست نظر آتے ہیں۔ مغربی فکر اور فلسفہ میں کئی نسلوں سے جاری کوششوں کے نتیجے میں انسانی زندگی کو مذہب اور سیکولرازم میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور مذہب کا اثر ونفوذ بھی گزشتہ ایک صدی میں کم ہو کر صرف عقائد (DOGMA)، عبادات (MODES OF WORSHIP) اور مذہبی وسماجی رسومات (SOCIAL COSTUMS & RITUALS) تک محدود ہو گیا ہے جبکہ زندگی کا وسیع تر گوشہ اجتماعی زندگی سمیت سیکولرازم کے زیر اثر آ گیا ہے اور یہ سوچ عالمی بن گئی ہے اور مسلمانوں کی بھی ایک قابل لحاظ تعداد اسی سوچ کی حامل ہی نہیں داعی ومبلّغ بھی بن گئی ہے ان حالات میں اہل مغرب حضرت محمد ﷺ کے مقام کا شعور اور VISION ہی نہیں رکھتے تو آپ ﷺ کی عظمت کا شعوری اظہار کیسے کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسانی زندگی کے جو گوشے آج مغرب نے اسلام دشمنی میں سیکولرازم کے ماتحت کر دیے ہیں ان کے بارے میں تعلیمات پیغمبر کا جائزہ لیں اور گہرائی میں جائیں تو مجھے یقین ہے کہ ہر مسلم وغیر مسلم عظمتِ مصطفےٰ پر عش عش کر اٹھے گا اور یہ حقیقت سامنے آئے گی جو ایک شعر میں ذرا سے لفظی تصرف کے ساتھ پیش خدمت ہے:

ذرا انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر شخص پکارے گا کہ ہمارے ہیں محمدؐ

یوں تو انسانی زندگی ناقابل تقسیم وحدت ہے اور قدیم وجدید کا قصہ ہو یا ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ کی لکیر یا خواندہ اور ناخواندہ اقوام کا مفروضہ ـــــ انسانی زندگی ایک ہی طرح کے گوشوں میں پہلو بہ پہلو رواں دواں ہے۔ آج جن گوشوں کو مذہب کے اثرات سے پاک اور تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر آزاد سمجھا جاتا ہے وہ اجتماعی زندگی کے تین گوشے ہیں:

1۔ حکومتی وسیاسی گوشہ

2۔ معاشی واقتصادی گوشہ

3۔ سماجی ومعاشرتی گوشہ

انسانی زندگی کی تاریخ میں مختلف ادوار میں اِنہیں میں سے کوئی نہ کوئی گوشہ اہمیت کا حامل رہا ہے پہلے معاشی گوشہ ذرا دبا ہوا تھا سیاسی جبر اور ظلم کی وجہ سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی، کروٹ بدلی اور اجتماعی جدوجہد کے نتیجے میں انقلاب فرانس آیا، سیاسی میدان میں عظیم پیش رفت سامنے آئی جمہوریت نے رواج پایا آج دنیا میں سیاسی گوشہ کے ساتھ سماجی اور معاشرتی گوشہ پہلو بھی بہت نمایاں ہیں تاہم گزشتہ چند دہائیوں سے سب سے زیادہ اہم پہلو معاشی اور اقتصادی ہے۔

انسانی تمدن کی تاریخ میں ظلم و جور کا وجود بہت پرانا ہے اور انسان کے چند بگڑے ہوئے (PERVERTED) رویوں میں سے ایک اہم رویّہ ہے۔ اس کے برعکس عدل و انصاف، برابری، کمزوروں کے ساتھ ہمدردی اور دکھی انسانیت کی خدمت بہت اعلیٰ انسانی رویے ّ ہیں تاریخ انسانی میں روئے ارضی پر چند مختصر ادوار کو چھوڑ کر ظلم اور ناانصافی کا ہی دور رہا ہے۔ تاہم یہ بات بھی بلاخوف کہی جاسکتی ہے کہ فرعون کا دربار ہو یا نمرود کا، اسکندر کی محفلِ امراء ہو یا خسرو پرویز کی، عمائدین سلطنت کی مجلس ہر دور میں ظلم کے خلاف حق بات کہنے والے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں اور انسانی رویوں کو ظلم کی راہ سے ہٹا کر انصاف اور برابری کی راہ پر ڈالنے کے لئے جان پر کھیلتے رہے ہیں اور اپنا سب کچھ قربان کرتے رہے ہیں۔

ان مردانِ حق کو دنیا پہچانتی ہے گزشتہ چار پانچ ہزار سال کی معلوم تاریخ انسانی میں ایسے لوگوں میں وہ لوگ بہت نمایاں ہیں جو اپنے پیروکاروں میں نبی اور رسول (علیہم السلام) کہلائے ایسے اہم اور جرأت مند انسانوں میں سے چند بہت ہی بڑے نمایاں اور قابل احترام نام ہیں نوح d، ابراہیم d، اسماعیل d، حضرت یوسف d، موسیٰ d، داؤد d، سلیمان d اور عیسیٰ d کے بعد پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد ﷺ۔ یوں تو جناب ابراہیم d

کے کارنامے اور جرأت آموز رویے کچھ کم قابل ستائش نہیں ہیں اور فرعون جیسے (امریکی ذہن رکھنے والے خود پرست) بادشاہ کے آگے حضرت موسیٰ d کی سرگزشت بھی کمزوروں کے لیے حوصلہ کا پیغام اور ناتوانوں، ضعیفوں، مظلوموں اور بے آسرا قیدیوں کے لئے روشنی کا مینار ہے۔ ایسے کئی انبیاء علیہم السلام تو اسی پاداش میں قتل بھی کر دیے گئے اور دنیا بھر کے غریبوں اور مظلوموں کا دل اس بات پر دکھتا ہے جب حضرت عیسیٰ d جیسے فرشتہ صفت انسان کو کچھ مفاد پرستوں نے اپنی راہ کا پتھر سمجھ کر سولی پر لٹکانے کے لیے رومیوں کے حوالے کر دیا تھا تاہم اس فہرست میں ذاتی سطح پر ظلم و جور کا نشانہ بننے والے اور جان گسل محنت کر کے کامیاب ہونے والے حق پرست انسان حضرت محمد ﷺ کا نام بڑا نمایاں اور مرکزی تھا اور ہے اور رہتی دنیا تک اسی طرح مرکزی اہمیت کا حامل رہے گا۔ اگرچہ THE HUNDREDS نامی کتاب کے عیسائی مورخ نے تو انسانیت کے اس محسن ﷺ کو نسل انسانی کا عظیم ترین اور قابل ترین فرد قرار دیا ہے تاہم دیگر مستشرقین حضرت محمد ﷺ کے پیروکار نہ ہوتے ہوئے بھی اور غیر مسلم دنیا کے بیشتر اہل عقل و دانش نے انہیں آزادی، مساوات اور عدل کا پیغمبر قرار دیا ہے۔

اس عظیم ترین ہستی ﷺ کے نظریات اور خیالات کیا تھے؟ اور ان کی زندگی میں اور وفات کے بعد کیسے بروئے کار لائے گئے اور نسل انسانی کو ان کی تعلیمات سے کیا فائدہ حاصل ہوا؟ دنیا بھر کے تمام قابل ذکر عظیم انسان حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کی آفاقیت اور عملیت کے پیش نظر انہیں انسان کی فلاح کا نسخہ قرار دینے پر متفق ہیں۔ ان کی تعلیمات کا منبع اور سرچشمہ قرآن مجید ہے جو دنیا بھر میں گزشتہ چودہ صدیوں سے علمی اور مذہبی افق پر چمک رہا ہے اور آپ ﷺ کی ہدایات اور تشریحات دیگر مستند کتب (کتب احادیث) میں بھی درج ہیں جن کو کمال دیدہ ریزی اور صحت کے اعلیٰ معیارات کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔

آج بھی ان کتب کا جو ذی شعور انسان بے لاگ اور تعصّبات کے بغیر مطالعہ کرے گا وہ ان تعلیمات کی عظمت کا ویسا ہی اعتراف کرے گا جیسا کہ ماضی میں کیا گیا۔ آزمائش شرط ہے۔ ان کتب میں درج تفاصیل کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

- حضرت محمد ﷺ عرب کے محترم شہر مکہ (جہاں حضرت ابراہیم d اور حضرت اسماعیل d کا بنایا ہوا بیت اللہ موجود تھا اور لوگ انہیں دو پیغمبروں کی تعلیمات کے پیرو تھے) میں ایک معزز ترین خاندان میں پیدا ہوئے۔(571ء)
- اس ماحول کے مطابق پرورش ہوئی والد کا سایہ پہلے ہی اُٹھ گیا تھا والدہ بھی بچپن میں وفات پا گئیں۔ دادا عبدالمطلب اور بعد ازاں دو چچاؤں کی زیر کفالت رہے۔
- آپ ﷺ کا اخلاق و کردار بچپن سے ہی برائیوں اور منفی رویوں سے پاک تھا۔ غریب پروری، انسانی ہمدردی اور غمگساری کا پہلو نمایاں تھا۔ جوانی میں بکریاں چَرائیں پھر تجارت کی اور خداداد صلاحیتوں سے خوب نام کمایا اور منافع بھی۔
- آپ ﷺ کی اخلاقی حیثیت بہت اعلیٰ رہی۔ جھوٹ، بددیانتی، چوری، شراب، جوا سود سے مکمل طور پر اجتناب کیا اور سچائی، خدمت خلق، عدل، انصاف کے علمبردار بن کر اس ماحول میں زندگی گزاری۔
- آپ ﷺ کی فیملی لائف بھی ایک کھلی کتاب ہے۔ عام مصلحین اور نامور انسانوں کے برعکس اور بادشاہوں، فاتحین اور لیڈروں کی نجی زندگی سے بہت مختلف زندگی گزارنے والا یہ انسان جوانی میں بھی حضرت یوسف d (اور دیگر پیغمبروں) کی طرح ہر قسم کی اخلاقی برائیوں سے پاک رہا۔ اگرچہ اس معاشرے میں بھی بے راہ روی کے سارے ذرائع موجود تھے۔ 25 سال عمر تک کاروباری اسفار اور مالی آسودگی کے باوجود ہر طرح کی اخلاقی آوارگی سے بچے رہے (جو کہ آج کی مغربی دنیا میں ناقابل تصور ہے) 25 سال کی عمر سے لے کر اور 53 سال کی عمر تک عملی زندگی حضرت خدیجہ k کے ساتھ (MARRIED LIFE) گزاری۔ آپ ﷺ کی زندگی کے نجی گوشے بھی پبلک لائف کی طرح روز روشن کی طرح عیاں ہیں ان کی وضاحت ضمناً اس لئے ضروری ہے کہ پاک تعلیمات کے لئے پاک کردار شرط ہے، جو آپ ﷺ کا نمایاں ترین وصف رہا۔
- آپ ﷺ کی پاکیزہ نجی اور خانگی زندگی آج کے مغربی معاشرے میں ناقابل تصور ہے۔ جہاں راجے، مہاراجے، لارڈز، حکمران اور ارب پتی تاجر تو کیا ایک اوسط مغربی مرد یا عورت کے لیے FAMILY LIFE کا تصور ہی مصیبت ہے اور 50 سال کی عمر تک ایک عام امریکی

شہری (ٹائم میگزین کی ایک سابقہ رپورٹ کے مطابق) 1000 مردوں یا عورتوں سے تعلقات قائم کرتا ہے (افسوس کہ بعد کے دور میں بعض مسلمان خلفاء، حکمران اور امراء نے بھی یہی LIFE STYLE اختیار کرلیا۔ تاہم مسلم معاشرے آج تک اس بے راہ روی سے بالعموم بچے ہوئے ہیں) یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ 98ء میں امریکی صدر نے کہا تھا کہ 50% سے زیادہ امریکیوں کو اپنے باپ کا نام معلوم نہیں یعنی ان کی پیدائش ILLEGAL تعلقات کا نتیجہ ہے۔

- آپ ﷺ نے چالیس سال کی عمر سے تریسٹھ سال کی عمر تک اپنی تعلیمات لوگوں کے سامنے پیش کیں۔ معاشرے کا ردعمل بڑا ظالمانہ تھا۔ مذاق، استہزاء خریدنے کی کوشش، کردار کشی CHARACTER ASSASSINATION، سوشل بائیکاٹ، قتل کا فیصلہ اور جلاوطنی جیسے رویوں سے سامنا رہا مگر یہ پہاڑ کی سی استقامت رکھنے والا شخص اپنے موقف پر قائم رہا اور کسی لالچ میں نہیں آیا۔

- مکہ سے مدینہ ہجرت کے بعد اپنے وسائل کو POOL UP کیا اور مکہ کے ظالم LORDS اور عوامی خون چوسنے والے طبقہ کے خلاف جنگیں کیں، صلح کی پیش کش پر صلح کی اور مکہ والوں کی طرف سے صلح توڑنے پر حملہ کر کے مکہ فتح کرلیا اور پرانا فیوڈل اور سرداری نظام ختم کر کے ایک نئے طرز حکومت اور نئے سماجی اور اقتصادی نظام کی بنیاد رکھی۔

- آپ ﷺ کی معاشی زندگی اور LIFE STYLE نہایت سادہ اور مہذّب تھا آپ گھریلو کام اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے اور آپ کے رویوں سے مساوات انسانی اور عظمت انسانی ٹپکتی تھی۔

- آپ ﷺ نے اپنے پیروکاروں کی بھرپور تربیت کی اور انہیں اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ دنیا کی بعض تحریکوں اور MISSIONS کے لیے تو شاید کسی خاص قسم کی اخلاقی تربیت کی ضرورت نہیں بلکہ بے راہ روی، جنسی آوارگی، لوٹ کھسوٹ جیسے رویے ایسے لوگوں کا سامان سفر ہوتے ہیں مگر حضرت محمد ﷺ ایسے شائستہ (WELL MANNERED (CULTURED اور نفیس انسان تھے کہ جس کی مثال حضرات انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ملنا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کے لیے بھی انہیں خصوصیات اور معیارات کو اہم قرار دیا اور TENS اور

HUNDREDS میں نہیں بلکہ THOUSANDS میں ایسے DISCIPLES تیار کیے جو معاشرتی رویوں میں ہو بہو آپ کی COPY تھے یعنی اتباعِ رسول ﷺ کا کامل نمونہ تھے۔

- آپ ﷺ نے وفات سے قبل ایک خطبہ میں انسانیت کے لئے ایک چارٹر دیا جو آج بھی نمونہ ہے اور UNO چارٹر اِسی سے ماخوذ ہے۔ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمام انسان برابر ہیں، کالے گورے کی بنیاد پر کوئی فرق نہیں ہوگا''۔ بلکہ رنگ، نسل، زبان، جنس (SEX) پیشہ اور علاقہ کی بنیاد پر ہر قسم کی DISCRMINATION ختم کر دی اور تمام انسانوں کے لیے دوسرے انسانوں کی جان، مال، عزت، آبرو محترم قرار دے دی سوائے کسی جرم اور جواز کے۔
- نبی اکرم ﷺ نے معاشی بددیانتی اور نا انصافی کے تمام راستے بند کر دیے۔ جوا (CHANCE MONEY) لاٹری، انعامی سکیم، سود، سٹہ (SPECULATION)، بانڈز، FORWARD RADING,HOARDING SEXUAL EXPLOITATION کے ذرائع (از قسم عورتوں اور مردوں کی مخلوط محفلیں سینما، ڈرامہ، فلمیں، بے حیائی، جنسی جرائم وغیرہ) پر پابندی لگا دی انسانی محنت کی عظمت کا درس دیا۔ بنیادی طور پر معاشی جدوجہد کا مرد کو ذمہ دار ٹھہرایا اور عورت کو مستقبل کی بہتر انسانی نسل کی تربیت کے لیے گھر کی ملکہ قرار دیا تا کہ عورت کی عفت و عصمت کی حفاظت ہو سکے اور فرمایا: ''محنت مزدوری کرنے والا اللہ کا دوست ہے''۔

آپ ﷺ نے ایک وسیع علاقے کو فتح کر کے سابقہ حکمرانوں (جو انسان دشمن، عیاش، لٹیرے، جواری، ظالم اور منتقم مزاج تھے) کی جگہ ایسی مثال قائم کی کہ فتح مکہ کے وقت دشمن کو غیر مسلّح کر کے سب کو معاف کر دیا (برعکس امریکہ کی موجود فتح افغانستان اور عراق کے دلخراش واقعات کے) اور آپ ﷺ کے بعد آپ کے قریب ترین ساتھیوں نے معاملات کو عین اسی طریق پر (علیٰ منہاج النبوۃ) چلایا اور قیامت تک کے حکمرانوں کے لئے مثال بن گئے۔

آپ ﷺ نے ایک ایسے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کی بنیاد ڈالی جو عدلِ اجتماعی (SOCIAL JUSTICE) کا ایک نظام تھا جس میں:

- مساوات انسانی تھی اور رنگ نسل، خون، ذات، پیشہ اور جنس کی بنیاد پر کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔
- کمزور طبقات بالخصوص عورتوں کے لئے اعلیٰ حقوق کا اہتمام کیا گیا۔ نکاح یعنی عورت کی مکمل کفالت اور پردے کے احکام سے نسل انسانی کو تحفظ دیا گیا اور وراثت کے احکام دیے گئے عورت کو وراثت اور پراپرٹی اور تجارت کا حق دیا گیا۔ (یاد رہے کہ امریکہ میں عورت کو ووٹ کا حق اور تجارت کا حق صرف ایک صدی پرانا ہے)
- معاشی جدوجہد بنیادی طور پر مرد کے ذمے تھی۔ محنت کی عظمت تھی اور محنت کا معقول معاوضہ ملتا تھا۔ جہاں امراء سے زکوٰۃ لے کر ضرورت مندوں کو دی جاتی تھی جہاں کوئی بھوکا نہیں سوتا تھا جہاں معاشی استحصال نہیں تھا جہاں کفالت عامہ کا نظام تھا اور روٹی کپڑا مکان علاج اور تعلیم تمام شہریوں کے لیے (بشمول غیر مسلموں کے) حکومت کے ذمہ تھا۔
- انسانی بنائے ہوئے قوانین نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق عدالتیں کام کرتی تھیں اور اس پر عمل درآمد ہوتا تھا یعنی انسان، انسان پر حکمران نہیں بلکہ آئین اور قانون کی حکمرانی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت یعنی آسمانی ہدایت ناقابل ترمیم تھی جس کی رو سے تمام انسانوں کو عدل وانصاف میسّر تھا اور انصاف آسان اور سستا تھا۔ مجرم کو سزا بہر صورت ملتی تھی اور مجرم بڑا اور حیثیت والا ہونے کی وجہ سے بچ نہیں سکتا تھا۔

اسی سیاسی، اقتصادی اور سماجی نظام کی برکت تھی کہ 632ء تا 660ء میں چار ابتدائی مسلمان حکمرانوں کے دور میں عدل وانصاف، مساوات، قانون کی حکمرانی اور کفالت عامہ کی ایسی نادر مثالیں سامنے آئیں کہ انسان آج تک حیران ہے۔ اس دور میں حضرت عمر h نے عراق فتح ہونے پر جاگیرداری کو اسلام کے خلاف قرار دیا اور مفتوحہ علاقوں کی زمینوں کو STATE LANDS قرار دیا جس سے FEUDAL SYSTEM کا خاتمہ ہوگیا۔

اسی نظام کی برکات اور MERITS ہیں کہ ڈنمارک، سویڈن جیسے ممالک (جہاں پہلے حضرت محمد ﷺ کی توہین کے واقعات ہوئے تھے) میں عمر الڈ (حضرت عمر h کے نام سے

ماخوذ) کے نام سے ایک کفالت عامہ کا نظام جاری ہے جو حضرت محمد ﷺ اور ان کے اوّلین پیروکاروں کی دُوررس نگاہوں، نیک نیتی اور عظمت کی دلیل ہے۔

یہ دور خلافت ہی تھا جس میں کسی شہری کے ہاں فاقہ نہیں تھا۔ بچہ پیدا ہوتے ہی SUBSISTANCE ALLOWANCE ملنا جاری ہوتا تھا۔ جہاں بقول حضرت عمر h ایک کتا بھی بھوکا مر گیا تو عمر جوابدہ تھا۔ جہاں ایک عورت زکوٰۃ کی رقم دینے کے لئے گھر سے نکلی تو کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا آسودہ حالی کے ساتھ امانت و دیانت کا یہ عالم تھا۔

یہ وہ نظام تھا جو معاشی طور پر بہت کامیاب رہا اور آج بھی کامیاب ہوسکتا ہے بشرطیکہ مسلمان بالخصوص اور مغرب بالعموم حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کو پڑھے سمجھے اور میرٹ پر فیصلے کر کے اختیار کرے۔ مزید برآں اکیسویں صدی میں کم از کم کسی ایک مسلمان ملک میں اسلام کے اس عادلانہ نظام کے نفاذ کو برداشت کر کے اس کی برکات کو STUDY کرے۔

یہی SOCIAL JUSTICE کا وہ نظام تھا جسے اسلام کی برکات کے ضمن میں خلافت راشدہ کا نام دیا گیا ہے۔ اسی نظام کو لے کر جب مسلمان ایران پہنچے ہیں تو اس سوال کے جواب میں کہ عرب کے صحرا سے مسلمان کیوں اٹھ کر وقت کی ایک سپر پاور کو تہس نہس کرنے پر تل گئے ہیں، فرمایا: ''ہم (خود نہیں آئے بلکہ) ذمہ داری دے کر بھیجے گئے ہیں کہ انسانیت کو (فکری) اندھیروں سے نکال کر (شعور کی) روشنی میں لائیں اور بادشاہوں کے ظلم اور لوٹ کھسوٹ سے نکال کر اسلام کے عدل میں لے آئیں''۔

حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بعد صرف 50 سالوں میں اسلام کا تیزی سے پھیلنا اس بات کی غمازی کرتا ہے ان علاقوں میں پہلے غاصب اور ظالم حکمران تھے اور عدل و انصاف کے نظام کے آگے وہ نظام ٹھہر نہیں سکا۔ یہی کچھ ہزار سال پہلے کے ہندوستان میں ہوا کہ ظالمانہ سماجی رویّوں اور مذہبی اجارہ داری کے ساتھ معاشی بدحالی کی وجہ سے چند ہزار مسلمان (اقلیت جو 1947ء تک اقلیت ہی تھی) پورے ہندوستان پر صدیوں حکمران رہے۔

اسلام اور تعلیماتِ محمدی c کا یہ تصور ہی کچھ لوگوں کے لئے راستے کی رکاوٹ ہے۔ اسلام اور خلافت کے نظام کا ـــــ عدل و انصاف مساوات اور آزادی کے ہم معنی ہونا ہی

حقیقت اسلام ہے۔تقریباً ایک صدی قبل مولانا حالی نے مسدس حالی میں فرمایا تھا:

ے
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی برلانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

قرآن مجید میں آپ ﷺ کو رحمت للعالمین فرمایا گیا ہے۔اس نظامِ عدل وقسط کا قیام ہی آپ کی شانِ رحمت للعالمینی کا مظہر ہے جس سے اب تک مخلوق فائدہ اٹھارہی ہے اور اگر ظلم اسی طرح بڑھتا رہا تو دنیا اسلام کو خود آگے بڑھ کر اپنالے گی اور اس کی برکات سے عنقریب پوری دنیا پر (اسلام کے غلبے کے بعد) فائدہ اٹھائے گی۔

اس عادلانہ نظام کے منافع اور MERITS پر تاریخ گواہ ہے، زمانہ شاھد ہے اور ہزار ہا تصانیف موجود ہیں اس نظام کی برکات کی گواہی صدیوں وسطی ایشیا سپین، شمالی افریقہ اور ترکستان کے بام و در دیتے رہے اس نظام کو جاری کرنا انسانی خدمت اور کمزور کرنا انسان دشمنی ہے۔حضرت محمد ﷺ نے یہ احساس بھی اپنے پیروکاروں کو دیا کہ اس عادلانہ نظام کو کمزور کرنے والا شخص محض ان کا دشمن نہیں درحقیقت انسانیت کا دشمن ہے یہی وجہ ہے کہ دور نبوت کے آخری دنوں میں اور دور ابوبکر 632h ء۔634ء میں اسود عینی وغیرہ افراد نے اس عدلِ اجتماعی کے نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی تو محمد ﷺ کے جانثاروں نے اس کی سرکوبی کی اور اس فتنے کو دبا دیا اور جھوٹے مدّعیان نبوت کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دیا۔

اس عادلانہ نظام میں کفالت عامہ کے حقیقی تصور پر مبنی سیاسی اور سماجی ڈھانچہ، درحقیقت انسانیت کے لیے ایک نعمت اور انسانی ترقی کی معراج ہے، اس انسانی معراج کو چند خود غرض اور انسان دشمن لوگ اپنے لوٹ کھسوٹ کے پروگرام کے راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہیں اور اس کو DISGRACE کرنے، بے وقعت کرنے اور نا قابل عمل بنانے کے درپے رہتے ہیں اور آخری حربے کے طور پر اس نظام کو لانے والے اور متعارف کرانے والے حضرت محمد ﷺ کی ذاتی زندگی (جس پر کیچڑ اچھالا تھا کبھی سلمان رشدی نے جو آج بھی برطانیہ کی گود میں بیٹھا ہے) کو

داغدار کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تا کہ حضرت محمد ﷺ کی کردار کشی ہو اور لوگ ان کے مقام کو پہچاننے اور ان کے لائے نظام کو اپنانے کی بجائے اپنی نظروں سے گرا دیں اسی PHENOMENON کی مثالیں وقتاً فوقتاً مغربی پریس میں سامنے آتی رہتی ہیں۔

توہین آمیز خاکے اور توہین رسالت کے حالیہ دیگر رویّے بھی اس عدلِ اجتماعی کے نظام کو انسانیت کی نگاہوں سے اوجھل کرنے اور یورپ و امریکہ میں تیزی سے پھیلتے ہوئے اسلام کا راستہ روکنے کے لئے وضع کیے گئے پروگرام کا حصہ ہیں۔ یہ مجرّد پریس اور چند کارٹونسٹوں اور چند افراد کی کوشش نہیں ہے بلکہ ایک مافیا اور MASTER MIND ہے جو اس کو لے کر آگے چلنا چاہتا ہے اور دنیا پر NEW WORLD ORDER کے ذریعے چند انسانوں کی حکومت قائم کر کے سارے معاشی وسائل کو قبضے میں لینا چاہتا ہے۔ جبکہ WTO اور WB اور IMF کے مارے ہوئے عوام ایک عادلانہ، منصفانہ اور کفالت عامہ کے تصور پر مبنی معاشی نظام کی تلاش میں ہیں۔ دیکھئے عوام جیتتے ہیں یا یہ مافیا۔

یہ مافیا کون لوگ ہیں؟ اور کہاں ہیں؟ اس کا سراغ لگانے کے لیے بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا۔ یوں تو دنیا میں ہر وہ طبقہ جو دوسروں کی کمائی پر نگاہ رکھتا ہے اور مستقل طور پر اس کو لُوٹ کر اپنا مفاد حاصل کرتا ہے، وہ اس مافیا میں شامل ہے۔ اس میں عام طور حکمران طبقہ، جاگیردار طبقہ، بہت سارے کلب اور تجارتی ادارے شامل ہیں حتیٰ کہ کافی مذہبی گروہ بھی اسی طبقہ کا حصہ ہیں جو دنیا میں عادلانہ اور SOCIAL JUSTICE کے نظام کو اپنے مذموم مقاصد اور اپنی عیش پرستی کے لئے موت کا پیغام سمجھتا ہے اس میں شاید مشرق و مغرب کی بھی کوئی تقسیم نہیں ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا بھر کے سچائی کے قدردان اٹھ کھڑے ہوں، انصاف کے علمبردار بن کر میدانِ عمل میں کود پڑیں، مظلوم و مقہور طبقات سر پر کفن باندھ لیں، تھرڈ ورلڈ کے عوام اور غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے ممالک کے عوام نکل کھڑے ہوں (کہ دنیا میں عدل و انصاف کا قیام ہی ان کے مسائل کا حل ہے) تو کرۂ ارض پر قتل و غارت، بے سکونی، بے اطمینانی، بے حیائی اور محرومیوں کا یقینی خاتمہ ہوسکتا ہے بصورت دیگر عالمی مافیا کا یہ

عفریت جلد ہی ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ ذمہ داری ان حضرات کی ہے جو حضرت محمد ﷺ کے پیروکار ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں کہ وہ اپنی وفاداری کا حق ادا کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں اور اپنی وفا کا کعبہ، روپے پیسے اور ڈالر کی بجائے تعلیمات محمد ﷺ کو بنائیں۔ مغرب کے نظریات (بے حیائی، عریانی، آزاد خیالی وغیرہ) کو رد کر کے امانت، دیانت اور شرافت کا پیکر بن جائیں اور دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کرنے کا فریضہ سرانجام دیں۔ یہ وقت کی پکار ہے اور وقت کی ضرورت ہے! اور مغربی یلغار کا واحد علاج ہے۔

وہ عالمی مافیا جو حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات اور ان کے لائے ہوئے عادلانہ نظام کا دشمن ہے اس کو پہچاننا مشکل ہے۔ تاہم کچھ لوگوں کی رائے میں (اور وہ اہم ہے) یہ مافیا نیو ورلڈ آرڈر کے نام سے کام کر رہا ہے اور دنیا بھر کے ارب پتی یہودی اور ان کے ہم خیال اس کی پشت پر ہیں اور قابل افسوس بات ہے کہ امریکہ بطور ملک، امریکی بطور عوام اور امریکی حکومت اس مافیا کے اسی طرح فرمانبردار ہیں جس طرح افغانستان کا حکمران کرزئی امریکی حکومت کے سامنے سرنگوں رہتا ہے۔

ایک اور بات کی طرف اشارہ بھی شاید بہت سے عقلمندوں اور ذی شعور لوگوں کو فائدہ دے جائے آپ کبھی امریکی کرنسی میں ایک ڈالر کا نوٹ دیکھیں تو آپ کو اس عالمی کے کچھ نشانات ملیں گے۔ اس ایک ڈالر کے نوٹ پر ایک طرف 1776ء کے سن کے ساتھ ORDO NOVO SECLORUM یعنی سیکولر بنیادوں پر نیو (ورلڈ) آرڈر لکھا ہوا ہے اور یہ سوچ 1776ء یعنی امریکہ میں آئینی حکومت کے آغاز ہی سے ہے اور موجودہ امریکی آئین، روایات، حکومت، میڈیا، عوام اور مذہب کا حصہ ہے۔ اس سے شاید آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وہ عالمی مافیا جو حضرت محمد ﷺ کی دشمنی پر جی رہا ہے اور اس عادلانہ نظام کو انسانیت کی نگاہوں سے اوجھل کرنا چاہتا ہے کہ یہ عادلانہ اجتماعی نظام کہیں آشکارا ہو کر دکھی انسانوں کے دلوں کی آواز نہ بن جائے امریکہ میں کہیں چھپا ہوا ہے اگر آج دنیا ایک گلوبل ویلج ہے تو دوسرے ممالک میں بھی اس کے اثرات پھیل رہے ہوں گے۔ مزید غور فرمائیں تو اسی ایک ڈالر کے نوٹ پر دوسری طرف دیکھیں تو اہرام مصر کی تصویر ہے جس کے عین اوپر ایک انسانی آنکھ بنی ہوئی ہے بھلا امریکہ کا اہرام مصر سے

کیا تعلق؟ دماغ پر زور دیں یہ بنی اسرائیل ہیں، یہود ہیں جو کبھی مصر میں فرعون کے غلام تھے اور اہرام مصر کی تعمیر میں جبراً کام کر رہے تھے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نیو سیکولر ورلڈ آرڈر در اصل یہود کا نظام ہے JEW WORLD ORDER ہے یہی یہود ہیں جو سودی نظام پر قابض ہو کر دنیا بھر کے کاروبار پر چھائے ہوئے اور ارب پتی ہیں (ڈالرز میں) اسرائیل ملک کا شوشہ انہوں نے چھوڑا، ملک بنایا اور اب اس ملک کو GREATER ISRAEL میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور ترقی اور آزادی کے نام پر ساری دنیا کے وسائل پر قبضہ رکھنا چاہتے ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ نہایت قلیل تعداد (13 ملین) یہود کی آبادی پوری دنیا پر کسی جمہوری اصول سے حکومت نہیں کر سکتی لہٰذا سیکولر سوچ کے ساتھ نیو ورلڈ آرڈر اور عالمی زراعت اور کاروبار پر WTO کے ذریعے قبضے کا خواب دیکھا گیا ہے جواب روبعمل آ رہا ہے اس منصوبے کے راستے میں پاکستان (مسلمان ایٹمی طاقت)، محمد عربی ﷺ کے غلام کہلانے والے مسلمان اور ان کے رہنما یعنی حضرت محمد ﷺ کی آفاقی تعلیمات ہیں جو رکاوٹ ہیں۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کا ایک حل اس مافیا نے سوچا ہے کہ ایک تیر سے تین شکار کر لیے جائیں عظمت مصطفےٰ ﷺ کو پارہ پارہ کر دیا جائے، مسلمانوں کے دل سے حضرت محمد ﷺ کی ناموس پر مر مٹنے کا جذبہ سرد کر دیا جائے اور ان کی تعلیمات کو اپنی دانست میں داغدار اور آج کی اصطلاح میں ''دہشت گردی'' سے جوڑ کر بے وقعت کر دیا جائے۔ یہ ہے ـــــــ ان کارٹونوں اور ٹی شرٹوں پر ان خاکوں کی پرنٹنگ کا مفاد۔ ابھی اس منصوبے کا اور بہت کچھ سامنے آنے والا ہے ان خاکوں کے پیچھے اُس مافیا کو پہچاننے کی ضرورت ہے جس نے ان کارٹونسٹوں کو خرید کر ان سے کام کرایا، خوب معاوضہ دیا اور وعدے لیے اور مراعات دیں۔

مسلم امت یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ وہ کارٹونسٹ اور اخبار کا مدیر معافی مانگے، مذکورہ فلم ساز کو غلطی کی سزا دی جائے۔ وہ تو خریدے جا چکے وہ کیسے معافی مانگیں گے وہ تو ایک لحاظ سے یہود کے دام میں آ کر پھنس چکے ہیں نہ پیسے واپس کر کے ضمیر کی آواز پر اپنے کیے پر نادم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے پیچھے چھپے مافیا کی خبر دے سکتے ہیں۔ ایک جرم ہوتا ہے ایک اعانت جرم اس اخبار کے ایڈیٹر اور اگلے درجے میں اس ملک کے وزیر اعظم ان کے حق میں بولنے والے امریکی صدر اور

عوام سب مجرم ہیں مگر سب سے بڑا مجرم مافیا ہے جو اس کے پس پردہ ہے اور جس کو پہچاننے کی ضرورت ہے اور صرف مافیا کو پہچاننے کی نہیں اس کے خوفناک عزائم پہچاننے کی ضرورت ہے اس کے ہتھکنڈے (TOOLS) پہچاننے کی ضرورت ہے۔ کون کون سا ملک اور ادارہ اور حکمران اس مافیا کے ہاتھ استعمال ہو رہا ہے (صدر بش نے توہین آمیز خاکے شائع کرنے والے ملکوں کو حوصلہ دیا کہ وہ معافی نہ مانگیں وہ ان کے ساتھ ہیں) پھر اس پر اکتفا نہیں اس مافیا کے عزائم پہچاننے کی ضرورت ہے اور باضمیر اور سچا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان عزائم کو پہچان کر ان کو ننگا کرنے اور دوسروں کو باخبر کرنے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔

تو ـــــ آج جو شخص بھی حضرت محمد ﷺ کی توہین کا مرتکب ہے یا ان کا نام اہانت کے انداز میں لیتا ہے یا ان کی تعلیمات کا مذاق اڑاتا ہے وہ دانستہ یا نادانستہ، توہین میں ملوث ہے اور اس توہین کا مطلب ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے آزمودہ نظام عدل و قسط (SYSTEM OF SOCIAL JUSTICE) کو انسانیت کی نگاہوں سے گرانے کا مجرم ہے اور انسانیت کو نیو ورلڈ آرڈر کے لٹیرے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے؛ لہٰذا ایسا شخص صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ انسانیت ہی کا دشمن ہے اور انسانیت کا قاتل ہے اور انسانی خون کا پیاسا ہے جو انسانیت کا معاشی قتل کر کے خود عیش و عشرت کی محفلیں سجانے کی فکر میں ہے۔

ہر باغیرت، ہوشمند اور با اصول انسان کو آج سوچ سمجھ کر آئندہ قدم اٹھانے کی ضرورت ہے کہ اس کا آئندہ قدم اور مستقبل کا لائحہ عمل کہیں اس کو اور پوری انسانیت کو ایک لمبے عرصے کے لیے یہودی نیو ورلڈ آرڈر کی گود میں ڈالنے کا سبب تو نہیں بن رہا اور یہ احساس اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ کاش میں تعلیماتِ مصطفےٰ ﷺ کو عام کر کے انسانی فلاح اور عدل و انصاف کے اس عالمی نظام کو عام کرنے میں اپنا حصہ ڈال سکوں تو شاید میں انسان دوست اور ماحول دوست نیز انصاف پسند اور اعلیٰ انسانی اقدار کا قدر دان شمار ہو سکوں اور اگر ایسا ہو تو یہ بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ شانِ رسالت ﷺ کی یہی عظمت ہے جس کا ہر مسلمان کو احسان مند ہونا چاہیے اور یہی آپ ﷺ کی شان رحمت للعالمینی ہے جس سے غیر مسلم بھی مستفیض ہوں گے جس کا ان کو معترف ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں محسنِ انسانیت ﷺ کے

اس احسان عظیم کے تصور کے پیش نظر ہر دم ان کا احسان ماننا چاہیے اور درود وسلام بھیجنا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

''بے شک اللہ ﷻ اور اس کے فرشتے (اِس) خاص نبی (حضرت محمد ﷺ) پر درود بھیجتے رہتے ہیں (اور بھیجتے رہیں گے) اے ایمان والو! (تمہاری وفاداری کا تقاضا یہی ہے کہ) تم بھی ان (ﷺ) پر درود بھیجتے رہو اور سلام بھی جیسے (وفاداری کا حق بنتا ہے) سلام بھیجنا۔''(56/33)۔

اور ایک دوسرے مقام پر آپ ﷺ کی شان کا ذکر ہے اور آپ ﷺ کے بدخواہوں (یعنی آپ ﷺ کے لائے ہوئے نظام کے دشمنوں) کی ابتری کا۔ سورۃ الکوثر کا مفہوم ہے

''بے شک ہم (اللہ جل جلالہٗ) نے آپ ﷺ کو (عظیم ترین نعمتوں کی) کثرت عطا فرمادی ہے پس آپ اپنے مربیّ (عطا کرنے والے) کی (رضا جوئی کے لئے) نماز ادا فرمائیں اور (اس کے مزید تقرب کے لیے قربانی کے) جانوروں کے خون (کی طرح اپنے وسائل بھی) بہادیں۔ بے شک آپ کا ہر مدّ مقابل ہی ابتر رہے گا''۔(3-1/08) ۔

یہ وہ RATIONALE اور منطق ہے جس کی رو سے اولاد آدم d کے اس کامل ترین سپوت ﷺ کے ساتھ دوسرے انسانوں کا معاملہ ایک انسان کا دوسرے انسان جیسا نہیں ہے جہاں بے جا ہنسی مذاق، بے ادبی، گستاخی، تلخ کلامی اور ناحق لڑائی کے مواقع آتے رہتے ہیں بلکہ ایک خاص الخاص انسان سے بڑھ کر ایک ایسے محسنِ اعظم کا ہے جس کے سامنے (احسان مندی کے اعتراف کے طور پر) ہمارے سر جھکے رہنے چاہئیں اور زبان پر ان کی تعریف اور احسانات کا تذکرہ رہنا چاہیے چنانچہ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا: ''جس کے سامنے میرا نام لیا جائے (یا آئے) اور وہ (احساس ممنونیت سے) درود نہ بھیجے وہ شخص تباہ ہوگیا''۔ ایک دوسرے فرمان میں ایسا شخص بخیل قرار دیا گیا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو احسان فراموشی اور احسان ناشناسی جرم ہی ایسا ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالك۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ
وَ صَلِّ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ

خودی کی حقیقت

(3)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
کی کتاب ''حکمتِ اقبال'' سے ایک باب

جیمز جینز کا معقول استدلال

سر جیمز جینز کا استدلال یہ ہے کہ مادّہ سب کا سب ریاضیاتی نسبتوں کی صورت میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ریاضیات کا دخل جس طرح ایک جوہر کی ہیئتِ ترکیبی میں نظر آتا ہے اسی طرح فلک کے نظامات میں بھی موجود ہے۔ ریاضیات کے قوانین جس طرح قریب ترین مادی اشیاء پر حاوی ہیں اسی طرح کائنات کے دور دراز حصوں پر بھی حکمران ہیں۔ لیکن ریاضیات کا علم جو ہمیں اس وقت حاصل ہے وہ کائنات کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوا بلکہ ہمارے اپنے منطقی یا عقلی استدلال سے حاصل ہوا ہے جس کا کائنات کے مطالعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اپنی قوتِ استدلال کی راہ نمائی میں اپنے ہی ذہن کی پیداوار کے طور پر قوانینِ ریاضیات کو مرتب کرنے کے بعد جب ہم کارخانۂ قدرت پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ نہ صرف کائنات کی تعمیر ان قواعد کے عین مطابق ہوئی ہے بلکہ یہی قوانین اس کائنات کی آخری صورت ہیں۔ چونکہ مادّہ غیر حقیقی ہے اس لئے کائنات آخر کار قوانینِ ریاضیات کے ایک مجموعہ کے بغیر کچھ ثابت نہیں ہوتی۔ ہم نے ان قوانین کو جو ہمارے شعور سے باہر کی دنیا میں جاری وساری ہیں، خود بخود کیونکر دریافت کر لیا اور پھر یہ قوانین مادّی دنیا کی تعمیر میں خود بخود کیونکر کام آئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ہماری طرح کے ایک شعور کی تخلیق ہے۔ یہ شعور ہماری طرح ٹھیک ٹھیک ریاضیاتی یا منطقی

انداز کے ساتھ سوچ سمجھ سکتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ خارج کی دنیا اور ہمارا اپنا شعور دونوں اسی شعورِ عالم نے پیدا کیے ہوں۔ سر جیمز جینز اپنی کتاب ''پراسرار کائنات'' میں لکھتے ہیں:

''کائنات کسی مادّی تشریح کی متحمل نہیں ہوسکتی اور میری رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اپنی حقیقت ایک خیال سے زیادہ نہیں۔ آج سے تیس سال پہلے ہم سمجھتے تھے یا فرض کرتے تھے کہ ہم ایک آخری میکانکی حقیقت کی طرف بڑھتے چلے جارہے ہیں آج دنیا بڑی حد تک اس بات پر متفق ہے (اور جہاں تک علم طبعیات کے ماہرین کا تعلق ہے، اس رائے سے اختلاف تقریباً مفقود ہے) کہ علم کا دریا ایک غیر میکانکی حقیقت کی طرف بہہ رہا ہے۔ کائنات ایک بڑی مشین یا کل کی بجائے ایک بڑے تصور کی صورت میں نظر آنے لگی ہے۔ اب شعور کوئی ایسی چیز ہے نہیں جو مادّہ کی دنیا میں اتفاقاً داخل ہوگئی ہو بلکہ اس کی بجائے ہم یہ گمان کرنے لگے ہیں کہ ہمیں شعور ہی کو مادّہ کی دنیا کا خالق اور حکمران قرار دینا چاہیے۔ ہمارے اپنے شعور کو نہیں بلکہ اس شعور کو جس کے اندر وہ جواہر جن سے ہمارا شعور صورت پذیر ہوا ہے، خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تازہ علم ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے پہلے جلد بازی سے قائم کیے ہوئے تاثرات پر یعنی یہ کہ ہم ایک ایسی دنیا میں آ پہنچے ہیں جو زندگی سے کچھ سروکار نہیں رکھتی یا زندگی سے عملاً عداوت رکھتی ہے، نظر ثانی کریں۔ اغلب ہے کہ مادہ اور شعور کی قدیم دوئی جو اس فرضی عداوت کی ذمہ دار تھی بالکل ناپید ہوجائے گی، نہ اس لئے کہ مادہ اور بے حقیقت ثابت ہوجائے گا یا شعور مادّہ ہی کی ایک خصوصیت بن جائے گا بلکہ اس لئے کہ ٹھوس اور حقیقی مادہ آخر کار شعور ہی کی ایک مخلوق یا شعور ہی کا ایک ظہور مانا جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کا ایک منظّم اور مدبر ہستی کا پتہ دیتی ہے جو ہمارے شعور کے ساتھ کچھ نہ کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ جس حد تک ہمیں علم ہوسکا ہے جذبات، اخلاق اور احساس کے اوصاف کے لحاظ سے نہیں بلکہ ایک ایسے اندازِ فکر کے لحاظ جسے ہم کسی بہتر لفظ سے تعبیر نہ کرسکنے کی وجہ سے ریاضیاتی اندازِ فکر کہتے ہیں۔

حیاتیات کے حقائق کی شہادت: برگستان اور ڈریش

تصوّری اور نوتصوّری فلاسفہ کے نظریات اور طبعیاتِ جدید کی شہادت کے علاوہ جن میں سے ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر ایک کے اندر اس خیال کی پرزور تائید موجود ہے کہ کائنات کی حقیقت روح یا شعور ہے، حیاتیات کے بعض حقائق بھی اس نتیجہ کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ ان حقائق کی بنا پر بعض منظّم فلسفے قائم کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک ارتقائے تخلیقی کا فلسفہ ہے جسے برگسان نے مدوّن کیا ہے اور دوسرا اینٹی لیجی کا فلسفہ ہے جسے ڈریش نے پیش کیا ہے۔ مادیت کے حامیوں کا خیال ہے کہ زندگی مادّہ کی ایک خاص حالت کے وصف کے سوا کچھ نہیں۔ جب مادہ ایک خاص کیمیاوی ترکیب کو پالیتا ہے تو اس میں زندگی کی خاصیت نمودار ہوجاتی ہے۔ حیوان جو اس طرح سے وجود میں آتا ہے ایک حساس مشین یا کل کی طرح ماحول کی کیفیات سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی جسمانی بناوٹ میں ایک تبدیلی ظاہر ہوتی ہے جوں جوں ادوار گزرتے جاتے ہیں ماحول کی ان نو بہ نو کیفیات کے باعث جن سے حیوان کا سابقہ پڑتا رہتا ہے اس تبدیلی میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس طرح حیوانات کی نئی نئی اقسام وجود میں آتی رہتی ہیں۔ لیکن حیاتیات کی تازہ تحقیقات اس نقطہ نظر کی حمایت نہیں کرتیں۔ پروفیسر جے ایس ہالڈین کا خیال ہے کہ وہ حکماء جو حیاتیات کا مطالعہ سنجیدگی سے کرتے ہیں اب اس بات کے قائل نہیں رہے کہ زندگی فقط مادہ کی خاص کیمیاوی ترکیب کا نتیجہ ہے۔ جرمنی کے ماہر حیاتیات ڈریش (DRIESCH) کے تجربات بالخصوص اس نتیجہ پر مجبور کرتے ہیں کہ ماحول کی خارجی کیفیات سے متاثر ہونے کے باعث جو حرکات ایک زندہ انسان سے سرزد ہوتی ہیں وہ ایک کل یا مشین کی حرکات سے یکسر مختلف ہیں۔ کل ایک بیرونی طاقت سے حرکت میں لائی جاتی ہیں اور خود چند اجزا کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس حیوان جسم کی ایک خاص شکل وصورت حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لئے ایک اندرونی میلان کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ایک مجموعہ اجزا کی طرح نہیں بلکہ ایک ناقابل تقسیم وحدت کی طرح عمل کرتا ہے جس کے اندر ایک رُجحانِ طبیعت ایسا ہے جو اس وحدت کی ضروریات کی خبر رکھتا ہے۔ اگر ہم ایک کیکڑے کی ٹانگ کاٹ دیں تو اس کی جگہ دوسری ٹانگ پیدا ہو جاتی ہے کوئی کل یا مشین اپنے ٹوٹے ہوئے پرزہ کو خود بخود مہیا کرنے کی

صلاحیت نہیں رکھتی۔

ڈریس نے ایک جنین کو اس کی نشوونما کے شروع میں تجربہ کے لئے دو حصوں میں کاٹا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا ایک حصہ بھی نشوونما پا کر مکمل حیوان بن جاتا ہے خواہ جنین کو کہیں سے کاٹا جائے اور خواہ اس کے اس ایک حصے کی نسبت کل کے ساتھ کچھ ہو۔ تجربہ کے نتائج میں کوئی فرق نہیں آتا اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ خلیات (CELLS) جو ایک مکمل جنین میں نشوونما پا کر سر بننے والے ہوں نامکمل جنین میں ٹانگ بن سکتے ہیں۔ دراصل جنین کا کوئی حصہ بڑھتے ہوئے حیوان کی ضرورت کے مطابق کسی عضو کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ ڈریش لکھتا ہے: ''یہ عجیب کل ہے جس کا ہر حصہ ایک جیسا ہی ہے۔'' سوال پیدا ہوتا کہ ایک حصہ کل کی حیثیت کیونکر پیدا کر لیتا ہے، جنین کے اعضاء کی نشوونما میں بھی یہی اصول کام کرتا ہے۔ اگر ایک نیوٹ (NEWT) کی دُم کاٹ دی جائے تو اس کی جگہ دوسری دُم پیدا ہو جاتی ہے اگر دم ابتدا ہی میں کاٹ دی جائے اور ایک تازہ کٹی ہوتی ٹانگ کے بقیہ کے ساتھ جوڑ دی جائے تو دم دم کی شکل میں نہیں بلکہ ٹانگ کی شکل میں نشوونما پانے لگ جاتی ہے۔ کائنات کے مادّی اجزا کا ذکر کر کے ہم اس قسم کے حقائق کی کوئی تشریح نہیں کر سکتے۔ اس لیے ڈریش نے جنین کی نشوونما کی تشریح کرنے کے لئے اس مفروضہ کو بیکار سمجھ کر ترک کر دیا کہ زندگی طبعیات یا کیمیا کے خاص خاص قوانین کے عمل کا نتیجہ ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہم حیاتیاتی ردّعمل کو کسی میکانکی نقطہ نظر سے نہیں سمجھ سکتے۔ اس کی نوعیت ایسی ہے جیسے ایک سوال کا معقول جواب یا ایک گفتگو کا کوئی ایسا حصہ جو کسی دوسرے حصہ کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔ حیاتیاتی ردِّعمل مکمل حیوان کا ردِّعمل ہوتا ہے اس کے کسی جزو کا ردعمل نہیں ہوتا۔ ضروری تھا کہ عملِ حیات کی تشریح کے لئے کائنات کا ایک اور روحانی یا غیر مادی عنصر تصور کیا جائے چنانچہ ڈریش نے طبعیاتی کیمیائی نظریہ کو رد کر کے اینٹی لیچی (ENTELECHY) کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ اینٹی لیچی گویا ایک سوچی سمجھی ہوئی تجویز ہے جو کسی نہ کسی طرح حیوان کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے اور اس کی قوتِ حیوان کی نشوونما کے دوران اس کے ہر ایک حیاتیاتی ردعمل میں نمودار ہوتی ہے۔ حیوان کے اندر ایک مدعا یا مقصد کام کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک مناسب شکل وصورت اختیار کرتا ہے۔ مقصد یا مدعا ایک ایسی خود اختیار تدبیری اور انتظامی قوتِ شعور ہے جو حیوان کے مجموعی مفاد کے لئے اس کو ڈھالتی اور

بناتی ہے اور جو خود اپنے ارادے کو بھی اس مفاد کے اقتضاء کے مطابق بدلتی ہے۔ ضروی ہے کہ یہ قوت کائنات کے اندر زندگی کی ساری نشوونما اور ارتقاء سے دلچسپی رکھتی ہو۔ برگسان اسی قوت کو قوتِ حیات (VITAL IMPETUS) کا نام دیتا ہے اس کے نزدیک اس قوت میں اور شعور میں کوئی فرق نہیں۔ ڈریش نے بھی اینٹی لیچی کا تصور شعور اور نفسیات کے مطالعہ کے لئے استعمال کیا ہے اس کے نزدیک جہاں حیاتیات جسم حیوانی کی شعوری نشوونما کا مطالعہ ہے۔ حیوان کا کردار جس میں انسان کا بھی کردار شامل ہے، حیوان کی نشوونما سے ملتا جلتا ہے دونوں ایک ہی مقصد یا مدعا کی طرف بڑھتے ہیں جس طرح سے حیوان کی نشوونما کی سمت ایک اینٹی لیچی سے متعین ہوتی ہے اس طرح اس کا کردار ایک مماثل نفسیاتی میلان سے مطمئن ہوتا ہے یہ میلان تازہ جنم لینے والے حیوان کی ان مفید حیات حرکات میں نمودار ہوتا ہے جنہیں وہ کسی تجربہ سے نہیں سیکھتا۔ زندگی کے مطالعہ سے اس طرح کے بعض اور حقائق کا بھی پتہ چلتا ہے جو ڈریش کے نتائج کی تائید کرتے ہیں۔ برگسان نے ان حقائق کو اپنی کتاب ارتقائے تخلیقی (CREATIVE EVOLUTION) میں اس بات کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ زندگی کا مخفی محرک یا مدعا ہی روئے زمین پر حیوانات کی اوّلین پیدائش اور پھر رفتہ رفتہ ان کی بلند تر اقسام کے ظہور اور ارتقاء کا باعث ہوا ہے۔

برگسان کا استدلال

لامارک (LAMARCK) نے حیوانات کے ارتقاء کی وجہ یہ بتائی تھی کہ ضروری ہے کہ ایک زندہ حیوان کی جسمانی بناوٹ ماحول کی کیفیات سے مطابقت پیدا کرے، جب یہ مطابقت پیدا ہو جاتی ہے تو حیوان کے جسم میں ایک تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جو اگلی نسلیں وراثتاً حاصل کرتی ہیں اور چونکہ یہ نسلیں خود بھی مجبور ہوتی ہیں کہ ماحول کے ساتھ جسمانی مطابقت پیدا کریں اس لئے موروثی تغیر میں اور اضافہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ حیوان کی ایک اور نئی قسم وجود میں آ جاتی ہے۔

اوّل تو یہ نظریہ اُن حقائق کے خلاف ہے جو اب اچھی طرح سے ثابت ہو چکے ہیں کہ حیوان کے جسم میں ایک نمایاں تبدیلی آہستہ آہستہ جمع ہونے والی چھوٹی تبدیلیوں کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ فوری طور پر بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ حیوان کے اندر کوئی شعوری یا غیر شعوری میلان ایسا موجود نہ ہو جس سے وہ ایک فوری تبدیلی اور اصلاح اختیار کر سکے۔

دوم ـــــــ ماحول کے ساتھ جسمانی بناوٹ کو مطابق کرنے کی ضرورت ارتقاء کے رُک جانے کی وجہ بن سکتی ہے لیکن اس کے جاری رہنے کی وجہ نہیں بن سکتی۔ جونہی کہ ایک حیوان کی جسمانی ساخت ماحول کے ساتھ اتنی مطابقت حاصل کرلے کہ وہ اس کی وجہ سے اپنی زندگی کو قائم رکھ سکے تو اس کے مزید بدلنے یا ترقی کرنے کی ضرورت ختم ہوجاتی ہے۔ اگر مطابقتِ ماحول فی الواقع زندگی کی حفاظت کے لئے عمل میں آتی ہے تو زندگی کی حفاظت کا انتظام ہوجانے کے بعد حیوان کو زیادہ منظّم اور ترقی یافتہ اجسام کی طرف ارتقاء نہیں کرنا چاہیے۔ برگسان لکھتا ہے:

''ایک چھوٹا سا جانور زندگی کے حالات کے ساتھ اتنی ہی مطابقت رکھتا ہے جتنا کہ ہمارا جسم، کیونکہ وہ اپنی زندگی کو قائم رکھنے پر قادر ہے تو پھر زندگی ایک ایسے جانور کے مرحلے پر پہنچ جانے کے بعد فنا کے خطرات سے بے پرواہ ہوکر مزید ترقی کے راستے پر گامزن کیوں رہتی ہے! زندہ حیوانات کے بعض اجسام جو ہم آج دیکھتے ہیں دور دراز زمانوں سے جوں کے توں چلے آئے ہیں اور ادوار کے گزرنے سے ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تو پھر زندگی کو آج سے پہلے کسی خاص جسم حیوانی پر جاکر ٹھہر جانا چاہیے تھا لیکن جہاں جہاں ممکن تھا یہ رُک کیوں نہ گئی؟ اگر خود اس کے اندر کوئی ایسی قوت محرکہ نہ تھی جو اسے خطرات کے باوجود زیادہ سے زیادہ تنظیم اور ترقی کی منزل کی طرف لے جانا چاہتی تھی تو پھر یہ آگے کس طرح بڑھتی گئی؟''

یہ حقائق اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ شعور مادہ سے پیدا نہیں ہوا بلکہ خود بخود موجود ہے۔ شعور خود ایک بنیادی حقیقت ہے اور مادہ کی خاصیات کا مظہر نہیں۔ اگر شعور اپنی جدا حقیقت رکھتا ہے تو مادّہ کے بے حقیقت ثابت ہونے کے بعد ہم آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ کائنات کی ساری حقیقت بھی یہی ہے اور مادہ اسی سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ جس طرح سے حیوانات کی مختلف قسمیں عمل ارتقاء سے وجود میں آئی ہیں اس طرح سے مادہ کی موجودہ حالت بھی عمل ارتقاء کا نتیجہ ہے جو قوت حیوانات کے ارتقاء کا سبب ہے وہی مادہ کے ارتقاء کا باعث بھی ہے۔ لہٰذا مادہ کی حقیقت بھی شعور ہی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ طبعیاتِ جدید اس نتیجہ کی پرزور تائید کرتی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ شعور کی صفات کیا ہیں؟

کائناتی شعور کی صفات

سر جیمز جینز شعور کی صرف ایک صفت یعنی کامل ذہانت یا کامل ریاضیاتی فکر تسلیم کرتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب ہم شعور عالم کی ایک صفت ریاضیاتی ذہانت کے قائل ہو جائیں تو ہم اس نتیجہ کو روک نہیں سکتے کہ اس کے اندر وہ تمام صفات موجود ہیں جو ہمارے علم کے مطابق شعور کا خاصہ ہیں اور بغیر کسی استثنا کے ریاضیاتی ذہانت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

سر جیمز جینز نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شعور عالم ریاضیاتی فکر کے اعتبار سے ہمارے ہی شعور کی طرح ہے لیکن کوئی وجہ نہیں کہ وہ شعور کی دوسری صفات کے اعتبار سے بھی ہمارے ہی شعور کی طرح نہ ہو۔ جہاں تک ہمارے تجربہ کا تعلق ہے ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ شعور کے اندر ریاضیاتی فکر تو موجود ہو لیکن شعور کی دوسری صفات مثلاً محبت، اخلاق، جذبات، طلب مدعا وغیرہ موجود نہ ہوں جس طرح دھواں تنہا نہیں ہوتا بلکہ آگ اور اس کی حرارت کے ساتھ پایا جاتا ہے اسی طرح سے ریاضیاتی ذہانت تنہا نہیں ہوتی بلکہ شعور کی باقی صفات کے ساتھ ان کے ایک پہلو کے طور پر پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ کے متعلق جہاں سے دھواں نکل رہا ہو یہ کہے کہ ہم دھوئیں کی حد تک تو جانتے ہیں کہ وہاں ضرور موجود ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ وہاں آگ بھی ہے تو یہ موقف علمی اور عقلی طور پر درست نہیں ہوگا جہاں ذہانت اور ریاضیاتی فکر کے اوصاف بدرجہ کمال ہوں گے وہاں شعور کی باقی صفات کا بحالت کمال ہونا بھی ضروری ہے۔ کامل ترین ذہانت کامل ترین شعور کا ہی ایک وصف ہو سکتی ہے اور کامل ترین شعور وہ ہے جو کامل طور پر اپنے آپ سے آگاہ اور خود شناس اور خود شعور ہو اس لئے شعور ایک ریاضیاتی فکر ہی نہیں بلکہ اپنے آپ سے بدرجہ کمال آگاہ ہونے کی وجہ سے ایک کامل شخصیت یا اَنا یا ایغو ہے۔ اسی کائناتی خودی یا ایغو کو مذہب کی زبان میں خدا کہا جاتا ہے اسی کے مقصد نے کائنات اور جسم انسانی کو پیدا کیا ہے۔ اسی کے مقصد کا دوسرا نام انسانی خودی ہے۔

انسانی خودی کا مرکزی وصف خدا کی محبت ہے

انسانی خودی کا سب سے بڑا اور مرکزی وصف یہ ہے کہ اس کے اندر خدا کی محبت کا ایک طاقتور جذبۂ عمل اپنا اظہار پانے کے لئے ہر وقت بے تاب رہتا ہے یہ جذبہ اس قدر طاقتور ہے کہ

اگر یہ بھٹک کر انسان کی کسی اور خواہش کو اپنا مقصود نہ بنالے تو انسان کی تمام انسانی اور حیوانی قسم کی خواہشات کو اپنے تابع رکھتا ہے اور اس کو اپنی غرض کیلئے استعمال کرتا ہے لہٰذا انسان فقط خدا کی محبت کا ایک طاقتور جذبہ ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں اگر یہ جذبہ ختم ہو جائے تو انسان بھی باقی نہ رہے۔

نہ ہو طغیان مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے یہی طغیان مشتاقی

اقبال نے مرید ہندی اور پیر رومی کی ایک گفتگو نظم کی ہے اس میں جب مرید ہندی پیر رومی سے پوچھتا ہے کہ آدمی کی حقیقت کیا ہے خبر یا نظر تو پیر رومی جواب دیتا ہے:

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

(آدمی کی حقیقت دیدار ہے اور دیدار سے مراد دوست یعنی خدا کا دیدار ہے، اس کے علاوہ آدمی جو کچھ ہے وہ اس کا چھلکا ہے)

خدا کی خواہش خودی کی اپنی خواہش ہے اور انسان کی حیوانی خواہشات خودی کی اپنی خواہشات نہیں بلکہ انسان کے جسم کی خواہشات ہیں جسم خودی کا خدمت گزار ہے اس کا حاکم نہیں اس کی وجہ جیسا کہ ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں یہ ہے کہ خودی انسان کے جسم سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ خودی نے اپنی غرض کے لئے انسان کے جسم کو اس کی تمام حیوانی قسم کی خواہشات کے سمیت جو اس کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے کام کرتی ہیں پیدا کیا ہے تاکہ خودی اپنے پیدا کیے ہوئے زندہ جسم میں موجود رہ کر خدا کی محبت کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

خودی کی حقیقت کا راز یہ ہے کہ وہ خدا کو چاہتی ہے اور اس کے سوائے اور کچھ نہیں چاہتی اور خدا کی محبت اسے تیغ برآں بنا دیتی ہے۔

خودی کا سر نہاں لا اِلٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا اِلٰہ الا اللہ

وہ شخص جو اپنے جسم کو ہی اپنا مقصد حیات قرار دے لیتا ہے وہ اپنی خودی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرے اور نشو ونما پا کر مکمل ہو جائے۔ لہٰذا وہ اپنی اس غیر دانشمندانہ

روش کے شدید نقصانات کو اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں بھی جھیلتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص دوسروں کی زمین میں گھر بنالے اور بعد میں لوگ اسے گرادیں یا دوسروں کا کام کرنے میں اپنی زندگی صرف کردے اور اپنا کوئی کام نہ کرے اور بعد میں کف افسوس ملتا رہے۔ مولانا روم ایسے شخص کو تنبیہ کرتے ہیں:

؎ در زمینِ مردمان خانہ مکن
کارِ خود کن کارِ بے گانہ مکن
کیست بے گانہ تن خاکئے تو
کز برائے اُوست غمناکیے تو

شاید یہاں یہ سوال کیا جائے گا کہ کیا کوئی عقلی اور علمی شواہد ایسے ہیں جو اقبال کے اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ انسان کا مرکزی وصف خدا کی محبت ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں سب سے پہلے انسان اور حیوان کے فرق پر غور کرنا چاہیے۔

ایک مثال سے انسان اور حیوان کے فرق کی وضاحت

اس میں شک نہیں، جبلّتی یا حیوانی خواہشات مثلاً جبلت تغذیہ، جبلت غضب، جبلت فرار، جبلت جنس، جبلت اموت، جبلت تفوق، جبلت انقیاد وغیرہ انسان اور حیوان دونوں میں مساوی طور پر موجود ہیں اس کے باوجود حیوان اور انسان میں کم وبیش کا فرق نہیں بلکہ مخلوقات کی قسم کا فرق ہے یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان ایک برتر اور بہتر قسم کا حیوان ہے یا حیوان ایک کمتر یا پست تر درجہ کا انسان ہے بلکہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انسان مخلوقات کی ایک قسم ہے جو حیوانات سے بالکل جدا اور ممتاز اور ممیّز ہے۔

ایک ایسی گھوڑا گاڑی کا تصور کیجیے جس میں بارہ گھوڑے اس طرح سے جتے ہوئے ہیں کہ ہر گھوڑا جدھر چاہے جاسکتا ہے اس قسم کی ایک گاڑی میں اگر گھوڑوں کو ضبط میں رکھنے والا کوچوان نہ ہوگا تو گاڑی کبھی دائیں طرف حرکت کرے گی اور کبھی بائیں طرف اور کبھی ٹھہر جائے گی اور پھر کبھی ایک رُخ پر اور کبھی دوسرے رُخ پر چلنے لگے گی لیکن اگر ہم دیکھیں کہ گاڑی نہایت تیزی اور آسانی کے ساتھ ایک خاص سمت میں حرکت کررہی ہے اور نہایت عمدگی اور صفائی کے

ساتھ جہاں جہاں ضرورت ہوتی ہے راستوں کے موڑ کاٹتی چلی جاتی ہے تو ہم فوراً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ گاڑی کے اندر کوئی ہوشیار کوچوان موجود ہے جو گھوڑوں پر پورا ضبط اور کنٹرول رکھتا ہے اور ہر ایک کو روک کر ایک خاص سمت میں چلا جا رہا ہے جو اس نے معین کی ہے۔ حیوان ایک ایسی گھوڑا گاڑی کی طرح ہے جو کوچوان کے بغیر ہو۔ اس کی فطری خواہشات یا جبلتوں میں سے ہر ایک تمام دوسری خواہشات سے قطع نظر کر کے اپنی تشفی کرتی ہے۔ حیوان کی ہر جبلت کے اندر ایک زبردست حیاتیاتی زور یا دباؤ ہوتا ہے جس کی وجہ سے حیوان اس کی تشفی پر مجبور ہوتا ہے ہر جبلت کی فعلیت بعض خاص اندرونی اور بیرونی حالات اور کوائف کے موجود ہونے پر آغاز کرتی ہے جن کے مجموعہ کو جبلت کی تحریک (STIMULUS) کہا جاتا ہے۔ جبلت کی تحریک اس وقت نمودار ہوتی ہے جب حیوان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی اور نسل کی بقا کے لئے ایک خاص قسم کا عمل کرے جب تحریک موجود ہو جائے تو حیوان جبلت کی فعلیت کو شروع ہونے اور انتہا تک پہنچنے سے روک نہیں سکتا حیوان اس قابل نہیں ہوتا کہ کسی بہتر اور بلند تر مقصد کے لئے اپنی کسی جبلت کی تشفی کو روک سکے، محدود کر سکے یا ترک کر سکے۔ دراصل حیوان جبلتوں کی تشفی سے بالاتر کوئی مقصد رکھتا ہی نہیں جب بھی حیوان کسی جبلت کی مخالفت پر مجبور ہوتا ہے تو اس کی ایک جبلت کسی دوسری جبلت کی مخالفت کرتی ہے جس کے بعد طاقتور جبلت کمزور جبلت کی جگہ لے لیتی ہے اور کمزور جبلت طاقتور جبلت کی تشفی کے لئے راستہ چھوڑ دیتی ہے۔

انسان کے معاملہ میں صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے انسان کی شخصیت ایک ایسی گھوڑا گاڑی کی طرح ہے جس میں ایک ہوشیار کوچوان موجود ہو۔ انسان میں بھی وہی جبلتیں ہیں جو حیوان میں ہیں اور انسان میں بھی ان کا حیاتیاتی زور یا دباؤ ویسا ہی ہے جیسا کہ حیوان میں ہے۔ تاہم انسان حیوان کے برعکس اپنی ہر جبلت کی تشفی کو جس حد تک چاہے روک سکتا ہے یا کم کر سکتا ہے یا بالکل ترک کر سکتا ہے تا کہ اپنی تمام جبلتوں کو اپنے کسی خاص مقصد کے ماتحت متحد اور منظّم کرے اور کسی مطلوبہ سمت کی طرف ان کے اظہار کی راہ نمائی کرے۔ انسان جب اپنی کسی جبلت کی مخالفت کرتا ہے تو اس کی مخالفت حیوان کی طرح بے اختیار اور خود بخود نہیں ہوتی بلکہ ایک اختیاری فیصلہ کے ماتحت ہوتی ہے بالعموم وہ اپنی جبلتوں کی مخالفت اس طرح سے کرتا ہے کہ اس

مخالفت کے دوران کسی جبلت کی تشفی ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام جبلتی خواہشات کو روک دیتا ہے بلکہ اپنی جان کو جس کی حفاظت کے لئے جبلتیں اپنا کام کرتی ہیں قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے تا کہ ہر مزاحمت کے بغیر کسی خاص مقصد کو جو اسے پسند ہے حاصل کر سکے۔ حیوان کی زندگی عمل کے الگ الگ خانوں پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے ہر خانہ پر کسی جبلت کا تسلط ہوتا ہے اور کسی خانہ کا اس سے پہلے اور بعد کے خانہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا اس کے برعکس ایک فردِ انسانی کی زندگی ایک منظّم کل یا وحدت کی صورت اختیار کرتی ہے اور ہر جبلت کے فعل کو (جس حد تک اس کو اپنی تشفی کی اجازت دی گئی ہو) اس طرح سے نظم وضبط میں لاتی ہے کہ وہ اس وحدت یا کل کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ انسان کی جبلتی خواہشات کی یہ تنظیم یا وحدت یا راہ نمائی یا تجدید جو انسان کی اس استعداد سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ جبلتوں کی مخالفت کر سکتا ہے ہرگز ممکن نہ ہوتی، اگر انسان کے اندر ایک ایسی خواہش موجود نہ ہوتی جو جبلتوں پر حکمرانی کر سکتی۔ انسان کی یہی پراسرار خواہش ہے جو اس کی شخصیت کی گھوڑا گاڑی کے ہوشیار کوچوان کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی شخصیت کے اندر وحدت اور تنظیم پیدا کرتی ہے اس خواہش کی خدمت اور اعانت کے لئے ہی انسان کی تمام دوسری خواہشات موجود ہیں۔

پراسرار حکمران ___ کون سی انسانی خواہش ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ پراسرار خواہش جو انسان کی شخصیت کی گاڑی کے ڈرائیو کا مقام رکھتی ہے اور اس کے تمام اعمال اور افعال کی قوت محرکہ ہے، کون سی ہے؟ اس سوال کے جواب میں ایک حقیقت بالکل واضح ہے کہ وہ کوئی ایسی خواہش ہی ہو سکتی ہے جس سے حیوان محروم ہے اور جو انسان ہی کا خاص امتیاز ہے۔

دورِ حاضر کے تمام حکماء جنہوں نے فطرت انسانی کے رموز واسرار پر قلم اُٹھایا ہے اس بات پر متفق ہیں کہ انسان میں خواہش موجود ہے کہ وہ کسی نصب العین سے محبت کرے اور یہ خواہش انسان سے نچلے درجہ کے حیوانات میں قطعاً موجود نہیں بظاہر نصب العین کی محبت کے علاوہ انسان میں اور خواہشات بھی ایسی ہیں جو انسان سے خاص ہیں اور حیوان میں قطعاً موجود نہیں مثلاً نیک عملی کی خواہش، جستجوئے صداقت یا علم کی خواہش، تخلیق حسن یا آرٹ کی خواہش لیکن یہ تینوں

خواہشات نصب العین کی خواہش کے ماتحت رہ کر اپنا اظہار پاتی ہیں، دراصل یہ تینوں خواہشات نصب العین کی محبت کے تین پہلو ہیں اور نصب العین کی محبت سے الگ اپنا وجود نہیں رکھتیں۔ نصب العین ایک ایسا تصور ہوتا ہے جسے انسان اپنے علم کے مطابق حسن اور کمال کی انتہا سمجھتا ہے۔ انسان سارا حسن جس کی وہ تمنا کرتا ہے اپنے نصب العین کی طرف منسوب کرتا ہے۔ نیکی صداقت اور آرٹ کی خواہشات کا منبع حسن کی یہی آرزو ہے جس کو انسان کا نصب العین اس کے خیال کے مطابق مکمل طور پر مطمئن کرتا ہے۔ حسن کی تمنا خواہ کوئی صورت اختیار کرے وہ دراصل انسان کے پسندیدہ نصب العین ہی کی تمنا ہوتی ہے۔ جب ہم اپنے اخلاق میں حسن کی تمنا کرتے ہیں تو اسے نیکی کا نام دیتے ہیں لیکن ہم اسی عمل کو نیک اور حسین سمجھتے ہیں جو ہمارے اپنے نصب العین سے مطابقت رکھتا ہے اسی طرح سے جب ہم اپنی معلومات میں حسن کی تمنا کرتے ہیں تو اسے علم یا صداقت کی جستجو کہتے ہیں لیکن ہم صرف ان ہی حقائق کو صحیح اور سچا سمجھتے ہیں جو ہمارے نصب العین سے مطابقت رکھتے ہوں یا اس کے خلاف نہ ہوں پھر اسی طرح سے جب ہم اپنی تخلیقات میں حسن کی تمنا کرتے ہیں تو اسے آرٹ کا نام دیتے ہیں لیکن کسی ایسی تخلیق کو حسین نہیں سمجھتے اور نہ اس کی تمنا کرتے ہیں جو ہمارے نصب العین سے مناسبت نہ رکھتی ہو۔ اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ انسان کی تمام خواہشات میں سے صرف ایک خواہش ایسی ہے جو صرف انسان میں ہے اور حیوان میں نہیں اور یہ مخصوص انسانی خواہش نصب العین کی محبت ہے۔ پھر کیا وہ پراسرار خواہش جو انسان کی جبلّتوں پر حکمران ہے جو اس کی شخصیت کی گاڑی کو اپنی مرضی کے مطابق جدھر چاہتی ہے چلاتی ہے اور جو اس کے تمام اعمال و افعال کا منبع اور سرچشمہ ہے یہی نصب العین کی محبت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب اِثبات میں ہوسکتا ہے اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کا نصب العین ہی اس کی تمام جبلتی خواہشوں کو کم کرتا یا ترک کرتا ہے بلکہ نصب العین کی محبت ہی وہ چیز ہے جس کی خاطر وہ خود اپنی جان عزیز کو بھی جس کی حفاظت کے لئے جبلتی خواہشات پیدا کی گئی ہیں قربان کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ تاریخ کے مسلسل واقعات اس بات پر گواہ ہیں کہ انسان دار پر چڑھ جاتا ہے، سینے پر گولی کھالیتا ہے، زہر کا پیالہ پی لیتا ہے لیکن نصب العین کی محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے باز نہیں آتا۔

خودی اور نصب العین کا باہمی تعلق

اقبال نے خودی اور اس کے نصب العین کے باہمی تعلق کا ذکر اس طرح سے کیا ہے کہ گویا خودی نصب العین کی محبت ہے اور نصب العین کی محبت خودی ہے۔ نصب العین کو اقبال کبھی مدعا کبھی مقصد، کبھی مقصود، کبھی آرزو اور کبھی تمنا کا نام دیتا ہے۔ خودی کی بقا کا دارومدار نصب العین کی محبت پر ہے اس لیے کہ خودی کی زندگی خودی کی حرکت کا ہی دوسرا نام ہے۔ اگر وہ حرکت نہ کرے تو مردہ ہے دریا کی ایک لہر کی طرح کہ جب تک وہ چلتی رہے لہر ہے، تھم جائے تو کچھ بھی نہیں۔

؎ ساحل افتادہ گفت بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج از خود رفتہ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر بروم گر نروم نیستم

زندگی یا خودی فقط حرکت یا ذوق پرواز یا ذوقِ سفر ہے۔

؎ سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

؎ ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

لیکن خودی کا سفر ہمیشہ اُس کے نصب العین کی سمت میں ہوتا ہے لیکن یہ سفر صحیح نصب العین کی سمت میں ہونا چاہیے جو خدا ہے۔ اسی لیے قرآن کا ارشاد ہے: فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ (یعنی جب کسی نصب العین کی طرف دوڑنا تمہاری فطرت ہے) تو خدا کی طرف دوڑو (جو سچا نصب العین ہے) خودی کی حرکت یا دوڑ یا پرواز یا اس کا سفر نصب العین کی محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ نصب العین کی محبت ہی خودی کو حرکت پر اکساتی ہے، اس کی حرکت کی سمت کو معین کرتی ہے اور اس کے کارواں کے لئے درا کا کام دیتی ہے۔

؎ زندگانی را بقا از مدعا ست
کارِ دانش را دِرا از مدعا ست

یہ کہنا کہ زندگی یا خودی یا حیات ذوقِ سفر کے سوائے کچھ نہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ زندگی یا خودی یا حیات فقط نصب العین کی محبت ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ خودی کے تمام اعمال و افعال اس کے نصب العین کے حصول کے لئے سرزد ہوتے ہیں۔ خودی اپنے آپ کو کلیتاً نصب العین کے تابع کر دیتی ہے اور اسی کو نیک و بد، خوب و زشت اور حق و باطل کا معیار بناتی ہے اور لہٰذا ہر فعل اور عمل کو اسی کی وجہ سے قبول کرتی یا ردّ کرتی ہے۔ نصب العین ہمارے عمل کی جان ہے اور جان ہی کی طرح ہمارے عمل کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے یہ ہمارا نصب العین ہی ہے جو ہمارے ہر عمل کا کیف و کم معین کرتا ہے۔

چوں حیات از مقصدے محرم شود ضابط اسبابِ ایں عالم شود
خویشتن را تابع مقصد کند بہر او چیند، گزیند رد کند
ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل؛ کیف و کم ازوے پذیرد ہر عمل

نصب العین ہی اعمالِ انسانی کی قوتِ محرکہ ہے

نصب العین ہی وہ قوت ہے جو خودی کے عمل کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے اس کی حرکت کو تیز کرتی ہے۔ اسی کی ایڑ سے خودی کے عمل کا گھوڑا بادصرصر کی طرح چلنے لگتا ہے۔ زندگی کی قوتیں سیماب کی طرح ہیں اگر ان کی کوئی سمت معین نہ ہو تو وہ کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف لڑھک جاتی ہیں۔ نصب العین ان قوتوں کے بہاؤ کی سمت متعین کرتا ہے۔ لہٰذا ان سب کو ایک مرکز پر لا کر مجتمع اور متحد اور منظّم کر دیتا ہے۔ نصب العین فرد کی زندگی کا ایک ایسا مرکز ہے جس کی طرف اس کی تمام قوتیں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ نصب العین کی محبت ہی خودی کے لئے ممکن بناتی ہے کہ اس دنیا کے تمام اسباب و ذرائع کو اپنے کام میں لائے کیونکہ نصب العین ہی ان کے استعمال کی ضرورت محسوس کراتا ہے اگر ہماری رگوں میں خون بڑی تیزی سے گردش کر رہا ہو یعنی اگر ہم اپنی پوری قوت سے سرگرمِ عمل ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ کسی نصب العین کی شدت محبت ہی ہمیں ایسا کرنے پر اکسا رہی ہے۔ نصب العین کی محبت کے بغیر ہم اپنی کسی اندرونی یا بیرونی قوت کو استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا کوئی مصرف ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا لہٰذا ہماری ہمت بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ نصب العین ایک ایسی قوت ہے جس کے اثر سے ایک پوری قوم کے ہاتھ پاؤں متحرک

ہوجاتے ہیں اور سینکڑوں نگاہیں بیک وقت اپنا زاویہ بدل لیتی ہیں گویا یہی وہ قوت ہے جو ایک قوم کے تمام افراد کو آپس میں متحد و منظّم کر کے ایک قوم بناتی ہے۔ نصب العین ہی خودی کی تمام ہنگامہ آرائیوں کا سبب ہے وہی اس کے خاموش اور پرسکون سمندر میں تلاطم پیدا کرتا ہے۔ اب اقبال کے الفاظ میں سنیے:

مدعا گردد اگر مہمیز ما — ہمچو صرصر مے رود شبدیز ما
مدعا رازِ بقائے زندگی — جمع سیمابِ قوائے زندگی
گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست — تیز از سعی حصولِ مدعا ست
مدعا مضرابِ سازِ ہمت است — مرکزے کو جاذبِ ہر قوت است
دست و پائے قوم را جنباند او — یک نظر صد چشم را گرداند او
آرزو ہنگامہ آرائے خودی — موج بیتابے ز دریائے خودی

ہمارے تمام چھوٹے چھوٹے مقاصد نصب العین کے ذیلی اور ضمنی مقاصد ہوتے ہیں جو اس کے ماتحت اس کی اعانت کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور ہم ان کو نصب العین کی محبت اور کشش ہی کی وجہ سے اہمیت دینے اور حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نصب العین کی محبت ہمارے تمام اعمال کی قوتِ محرکہ ہے وہی ان کو پیدا کر کے ان کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔

آرزو صیدِ مقاصد را کمند
دفترِ اعمال را شیرازہ بند

نصب العین کی محبت ہی وہ پُراسرار انسانی خواہش ہے جو انسانی شخصیت کی گاڑی کے زبردست کوچوان کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن شخصیتِ انسانی کی اس پراسرار مرکزی اور حکمران خواہش کے متعلق صرف یہ معلوم کر لینا کہ وہ کسی نصب العین کی خواہش ہوتی ہے کافی نہیں جب تک یہ معلوم نہ کیا جائے کہ وہ کون سے نصب العین کی خواہش ہے۔ کیونکہ نصب العین سینکڑوں ہو سکتے ہیں اور ان میں سے بعض مختلف درجوں پر اچھے اور بلند بھی ہو سکتے ہیں اور بعض برے اور پست بھی، ان میں سے کون سا نصب العین ہے جو درحقیقت اس خواہش کا مقصود ہے اور لہٰذا صحیح اور سچا نصب العین ہے۔ چونکہ نصب العین حسن و کمال کا ایک تصور ہوتا ہے اور نصب العین کی

خواہش حسن کی خواہش کا دوسرا نام ہے لہٰذا ایک بات بالکل واضح ہے کہ یہ خواہش ایک ایسے نصب العین کے لئے ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو یعنی جس کے اندر وہ تمام صفاتِ حسن بدرجہ کمال موجود ہوں؛ جن کا ہم تصور کر سکتے ہیں جو ان تمام نقائص سے کلیتاً پاک ہو جو ہمارے ذہن میں آ سکتے ہیں۔ حسن میں کمال کی خواہش اس لئے شامل ہے کہ جو چیز ناقص ہو وہ حسین نہیں ہو سکتی۔ نقص حسن کا نقیض ہے لہٰذا محبت کا دشمن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بسا اوقات ہم ایک ناقص تصور سے بھی محبت کرتے ہیں لیکن یہ اسی وقت تک ممکن ہوتا ہے جب تک کہ اس کا نقص ہماری نظروں سے اوجھل رہے جوں ہی کہ ہم اس کے کسی نقص کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ہمارے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہم اس کی محبت کو پھر کسی درجہ میں بھی قائم رکھ سکیں۔ اقبال کہتا ہے کہ ہمارا نصب العین ایسا ہونا چاہیے جس کا حسن مکمل طور پر دِلربا ہو جس کے حسن کا احساس یا عشق یہاں تک ترقی کر سکے کہ اس کی شدت اور گہرائی کے اندر کوئی کمی یا کسر باقی نہ رہے، یہاں تک کہ انسان کی خودی اس کے عشق کی شراب سے مست اور مخمور ہو جائے۔ اقبال کے نزدیک یہ نکتہ اس قدر اہم ہے کہ اسے جان لینا گویا زندگی کے راز سے واقف ہو جانا ہے اور اسے نہ جاننا رازِ زندگی سے بیگانگی ہے۔

اے ز رازِ زندگی بے گانہ خیز　　از شرابِ مقصدے مستانہ خیز
مقصدے از آسمان بالاتر　　دلربائے دلستانے دلبرے

کوئی نصب العین پوری طرح سے دلربا، دلستان اور دلبر نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ دل یا خودی کے تقاضائے حسن و کمال کو پوری طرح سے مطمئن نہ کرے یعنی جب تک کہ وہ حسن کی ان صفات سے بدرجہ کمال بہرہ ور نہ ہو جن سے ہماری خودی محبت کر سکتی ہے اور ان نقائص سے بدرجہ اَتمّ پاک ہو جن کو ہماری خودی نقائص سمجھ کر ناپسند کر سکتی ہے۔

کامل نصب العین کی صفات: غیر محدود اور لازوال حسن

انسان کے نصب العین کی ان عمومی اور مجمل صفات کی روشنی میں ہم اس کی مخصوص اور مفصل صفات بآسانی معلوم کر سکتے ہیں، مثلاً ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کا حسن غیر محدود اور لازوال ہو کیونکہ اگر ایک انسان یہ سمجھتا ہو کہ اس کے نصب العین کے حسن و کمال کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں جا سکتا تو وہ سمجھے گا کہ اس کا ایک حصہ یا ایک

پہلوحسن اورزیبائی کے اوصاف سے محروم ہےاور جہاں اس کا حسن ختم ہوتا ہے وہیں سے یہ محرومی شروع ہوجاتی ہے اور پھر اگر وہ یہ جانتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس کے نصب العین کا حسن ختم ہوجائے گا تو وہ یہ سمجھے گا کہ وہ اب بھی حسین نہیں کیونکہ اس کے حسن کو ختم کرنے والا کل کا دن آج بھی آنے والے دنوں میں شمار ہورہا ہے۔

ازلی اورابدی زندگی

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا نصب العین زندہ ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر کسی ایسی چیز کے تصور کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتا جو اس کے نزدیک مردہ اور بے جان ہو وہ خود زندہ ہے لہٰذا کسی ایسی چیز کے لئے جو مردہ ہونے کی وجہ سے اس سے پست تر درجہ کی ہو وہ محبت کا جذبہ محسوس نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس کی ستائش کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کی خدمت کے لئے طرح طرح کی قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہوسکتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حسن کی طرح اس کی زندگی غیر فانی ہو۔ کیونکہ اگر اسے یقین ہوجائے کہ اس کا نصب العین کل کو اپنی زندگی سے محروم ہونے والا ہے تو وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوگا کہ وہ آج بھی دائمی زندگی سے محروم ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے نصب العین کے اندر زندگی کے وہ تمام اوصاف جن سے وہ آشنا ہے موجود ہوں مثلاً یہ کہ وہ سنے، دیکھے، سمجھے، محسوس کرے اور اس کی محبت کا جواب محبت سے دے۔

محبت اور عدم محبت کے جذبات

انسانی دنیا میں اس کا کوئی مقصد یا مدعا ہو اور اسے اس بات کی قدرت حاصل ہو کہ وہ حصولِ مدعا کے لئے عمل کرے اور اپنے عمل کو کامیاب بنائے۔ دوسرے الفاظ میں اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ بعض اعمال کو پسند کرے اور بعض کو ناپسند اور جن اعمال کو پسند کرتا ہو ان کی اعانت اور امداد کرے اور جن کو ناپسند کرتا ہو ان کی مخالفت کرے اور بالآخر روک دے، اپنے مددگاروں اور چاہنے والوں کی حوصلہ افزائی کرسکے اور مخالفوں اور دشمنوں کو سزا دے سکے۔ مختصر یہ کہ ضروری ہے کہ اس میں محبت اور عدم محبت کے تمام جذبات موجود ہوں اور وہ اپنے مدعا کی پیش برو کے لئے ان کا اظہار کرے۔ اگر کسی انسان کے نصب العین میں یہ اوصاف موجود نہ ہوں یا ان میں سے کوئی ایک صفت بھی موجود نہ ہو اور وہ اس بات سے آگاہ ہوجائے تو اس کے لئے اس نصب العین سے

محبت کرنا اس کی سائش کرنا یا اس کی خدمت یا اعانت کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

محبت کرنے والے سے عمل کا مطالبہ

محبت ہمیشہ محبوب کی خاطر عمل کا تقاضا کرتی ہے اور اس عمل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ محبوب کی خوشنودی حاصل کی جائے اور وہ رضامند اور مہربان ہو اور وہ چاہنے والے سے قریب تر آ جائے۔ کوئی نصب العین رکھنے یا کسی نصب العین سے محبت کرنے کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ عمل کے ذریعہ سے اس کی جستجو کی جائے اس کی خدمت اور اعانت کی جائے اور اس طرح سے اس کا قرب ڈھونڈا جائے۔ لیکن اگر ایک نصب العین جس سے انسان محبت کرتا ہے نہ کوئی عمل پسند کرتا ہے اور نہ ناپسند کرتا ہے نہ اس کے نزدیک کوئی بات اچھی ہے اور نہ بری، دوسرے الفاظ میں انسانی دنیا میں اس کا کوئی مدعا ایسا نہیں جس کے حصول کے لئے وہ متمنی ہو تو اس کا چاہنے والا کیونکر جان سکتا ہے کہ اس کی خدمت اور اعانت کے لئے اسے کیا کرنا چاہیے۔ انسان اپنے نصب العین کی اعانت کے لئے عمل کرنا چاہتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ عمل کیا ہو! وہ ایسی محبت سے مطمئن نہیں ہو سکتا جو اس سے کسی عمل کا مطالبہ نہ کرے اور جو خود عمل کی صورت اختیار نہ کر سکے۔ اگر وہ یہ جانتا ہو کہ اس کا نصب العین نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے نہ جانتا ہے، نہ محسوس کرتا ہے نہ اس کی محبت کا جواب دے سکتا ہے نہ اس کی قدردانی کر سکتا ہے تو وہ اپنے کسی عمل سے کوئی تسلی نہیں پا سکتا اور اس کے دل میں اپنے عمل کو جاری رکھنے کے لئے کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ جسے ہم نیکی کہتے ہیں وہ انگریزی کی مشہور مثل کے باوجود کبھی آپ اپنا انعام نہیں ہوتی بلکہ آخر کار یہ دل نواز یقین ہمیشہ اس کا انعام ہوتا ہے کہ وہ اس کے نصب العین کے نزدیک، جسے وہ ایک شخصیت سمجھتا ہے، پسندیدہ ہے۔

قوت اور قدرت

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ایک انسان کا نصب العین پوری طرح سے طاقتور اور قوی ہو کیونکہ اگر وہ سمجھے کہ اس کا نصب العین اتنی قوت نہیں رکھتا کہ اپنے مددگاروں کو جو اس کے مدعا کی پیش برو کے لئے کام کرتے ہیں، نوازے یا اپنے دشمنوں کو جو اس کے مدعا کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں، سزا دے تو وہ محسوس کرنے لگے گا کہ ایسے نصب العین کی محبت یا اعانت

ایک بے سود مشغلہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی وہ دنیا کو اپنے نصب العین کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کی پوری سعی کرے گا اس کے دشمن اس کی کوششوں کو ناکام بنادیں گے اور جو کچھ اس نے بنایا ہے آسانی سے بگاڑ دیں گے۔لہٰذا وہ سمجھے گا کہ اس کا نصب العین کمزور اور ناتواں ہے اور اس کی محبت اور اعانت کا حقدار نہیں۔

نیکی

پھر ضروری ہے کہ اس کے نصب العین کے اندر نیکی کی تمام صفات بدرجہ کمال موجود ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صفات حسن کی صفات ہیں کیونکہ ہم انہیں چاہتے اور پسند کرتے ہیں اگر وہ محسوس کرنے لگ جائے کہ اس کے نصب العین کے اندر ان میں سے بعض صفات موجود نہیں یا موجود تو ہیں لیکن بدرجہ کمال موجود نہیں تو وہ اس کو ایک نقص تصور کرے گا اور اس سے محبت ترک کردے گا۔

بے مثلی اور بے چگونی

پھر اس کے نصب العین کو اپنی صفات میں بے مثل اور بے نظیر ہونا چاہیے کیونکہ اگر اسے معلوم ہو کہ دنیا میں کوئی اور تصور ایسا ہے جس کے اندر یہ صفات اسی درجہ کمال میں موجود ہیں تو وہ بیک وقت دو نصب العینوں سے محبت کرنے کے لئے مجبور ہوگا اور ایسا کرنا اس کی فطرت کے قوانین کی وجہ سے اس کے لئے ناممکن ہوگا۔کوئی شخص بیک وقت دو نصب العینوں سے محبت نہیں کرسکتا اور حسن کی صفات بھی ایسی ہیں کہ وہ ایک سے زیادہ نصب العینوں میں موجود نہیں ہوسکتیں۔

خالقیّت

آخر کار یہ بھی ضروری ہے کہ پوری کائنات کی تخلیق اس کے نصب العین کے مدّعا کے ماتحت اور اس کی خدمت اور اعانت کے لئے ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کا نصب العین خود کائنات کا خالق اور حکمران نہ ہو اور ان تمام صفات کا مالک نہ ہو جو ان دو صفتوں کے اندر مضمر ہیں۔اگر ایسا نہ ہو تو وہ قوانینِ قدرت جو کائنات کی مادّی، حیاتیاتی اور انسانی سطح پر کام کر رہے ہیں اس وجود کی تخلیق نہ ہوں گے جو اس کا نصب العین ہے۔لہٰذا اس کے اور اس کے نصب العین کے مشترک مدعا کے ساتھ متصادم ہوں گے اور وہ اور اس کا نصب العین اس قابل نہ ہوں گے کہ اس مدعا کو حاصل کرسکیں۔اور پھر اگر وہ جانتا ہو کہ کائنات جس میں اس کا اپنا وجود بھی

شامل ہے خود بخود وجود میں آ گئی ہے اور اس کے نصب العین کی حکمرانی کے دائرہ سے باہر ہے تو وہ محسوس کرے گا کہ اس کا نصب العین اس سے پست تر درجہ کا یا زیادہ سے زیادہ اس سے مساوی درجہ کا کوئی وجود ہے لہٰذا اس سے محبت کرنے یا اس کی خدمت و اعانت کرنے یا اس کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے کا کوئی جذبہ اپنے دل کے اندر محسوس نہیں کرے گا۔

یہ وہ صفات ہیں جو قرآن حکیم نے خدا کی صفات بتائی ہیں، یہی سبب ہے کہ اقبال رُومی کی زبان میں ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کو دیکھنے کی ایک آرزو ہے۔ ؎

آدمی دید است باقی پوست است　　　دید آں باشد کہ دید دوست است

خودی کی فطرت سے باہر قدم رکھنا ممکن نہیں

انسان کسی مذہب یا ملت میں چلا جائے وہ اپنی فطرت سے بھاگ نہیں سکتا اور مجبور ہوتا ہے کہ ہر حالت میں اپنی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرے اگر وہ خدا کی صفات کے حسن و کمال سے آشنا نہ ہو سکے اور لہٰذا خدا سے محبت نہ کر سکے تو اس کا جذبہ محبت کسی غلط نصب العین کے ذریعہ سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا نصب العین خواہ کچھ ہو وہ کوئی بے جان چیز مثلاً ایک پتھر یا درخت یا دریا یا پہاڑ ہو یا کوئی بت یا قوم یا ملک یا نسل ہو یا کوئی زندہ حیوان مثلاً گائے یا بندر یا سانپ ہو یا کوئی ایسا تصور ہو جو کسی نظریہ یا ازم کا مرکز ہو، انسان ہر حالت میں خدا کی محولہ بالا صفات کو اپنے نصب العین کی طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر منسوب کرتا ہے۔ مثلاً اگر اس کا نصب العین کسی ایسی چیز کا تصور ہو جو مردہ اور بے جان ہے تو پھر بھی وہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک زندہ شخصیت ہے جس کے اندر محبت اور نفرت اور قدرت اور قوت اور حسن اور نیکی اور صداقت کے اوصاف درجہ کمال موجود ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ اپنے تمام اعمال کو اس کے تابع کرے اور دل ہی دل میں اس سے دُعائیں مانگے اور برکتیں چاہے۔

مرا از خود بروں رفتن محال است　　؎
بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

(جاری ہے)

موجودہ اسرائیلی ریاست کا مستقبل؟

(سورہ بنی اسرائیل کی آیات 4 تا 8 کی روشنی میں)

محمد نذیر یٰسین

کچھ عرصہ قبل دوران سفر ایک ایسا نعرہ پڑھنے کو ملا جو اگرچہ عالمی اتحاد ثلاثہ (امریکا، بھارت اور اسرائیل) کے خلاف عوامی نفرت کا ایک اظہار تھا مگر اُس میں ایک لحاظ سے توہین باری تعالیٰ کے ساتھ ساتھ اللہ کے جلیل القدر پیغمبر، حضرت یعقوب d کی توہین کا پہلو بھی موجود تھا۔ یہ نعرہ کچھ یوں تھا: ''ایک سے بڑھ کر ایک ذلیل امریکا، بھارت اور اسرائیل''

ہم میں سے بہت سے لوگ جانتے ہیں (اور جو نہیں جانتے، اُنہیں بھی معلوم ہونا چاہیے) کہ ''اسرائیل'' حضرت یعقوب d کا لقب تھا اور اُنہی کے نام سے موجودہ صہیونی ریاست کو موسوم کیا گیا ہے۔ عبرانی زبان میں اسرائیل کا مفہوم بالکل وہی ہے جو عربی زبان میں لفظ عبداللہ (یعنی اللہ کا بندہ) کا ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں ہر اُس لفظ کے منفی، بے جا اور اندھا دھند استعمال سے گریز کرنا چاہیے جسے مذہبی حوالے سے تقدس کا درجہ حاصل ہو۔

امریکا، بھارت اور اسرائیل کی حکومتیں ایک طویل عرصہ سے عالمی اور ریاستی سطح پر جس دہشت گردی کا ارتکاب کر رہی ہیں، اس کی برائی و مذمت کے لئے ''ذلیل'' کا لفظ ویسے بھی کافی ہلکا دکھائی دیتا ہے۔ اُن کے بہیمانہ مظالم و جرائم کے بیان کے لئے نہ صرف سخت سے سخت تر الفاظ کا چناؤ ممکن ہے بلکہ انہیں بیان کرنے کے لئے دفتر کے دفتر بھی تحریر کیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ مکافاتِ عمل کے فطری و ابدی اصول کی روشنی میں ان اقوام یا ریاستوں کی بداعمالیوں کا نتیجہ، اُن

کے زوال یا خاتمہ کی صورت میں جلد یا بدیر ظاہر ہو کر رہے گا تاہم اسرائیلی ریاست کے مستقبل کے بارے میں قرآن حکیم، احادیث مبارکہ اور بائبل میں بعض لطیف اشارے بھی موجود ہیں۔ اس ضمن میں یہودیوں کی اجتماعی نفسیات، ان کی ہزاروں سالوں پر محیط تاریخ اور دوسری اقوام کے ساتھ ان کے تعلقات کار کا مطالعہ بھی بہت مفید رہے گا:

اس وقت دنیا میں یہودیوں کی آبادی کا تخمینہ ڈیڑھ کروڑ ہے جبکہ مسلمانوں کا ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ بیان کیا جاتا ہے۔ اتنی کم آبادی کی حامل ہونے کے باوجود یہ قوم آپس میں بہت زیادہ تقسیم وانتشار کا شکار ہے اور اس میں بے شمار نکتہ ہائے نظر ومتضاد خیالات ونظریات کے حامل لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک حدیث نبوی ﷺ کے مطابق بنی اسرائیل بہتر (72) فرقوں میں اور اُمت مسلمہ تہتر (73) فرقوں میں تقسیم ہوگی۔ اس روایت کی رو سے مسلمانوں کا انتشارِ باہمی (آبادی کے تناسب سے) یہودیوں کے انتشارِ باہمی کے سامنے بالکل ہیچ دکھائی دیتا ہے اور اسے اُمتِ مسلمہ کے اُمتِ یہود پر افضل وبرتر ہونے کی ایک علامت بھی کہا جاسکتا ہے۔

قرآن حکیم میں یہودیوں کی اس غیر معمولی تقسیم وانتشارِ باہمی کی وجہ، اُن کا باہمی بغض وعناد بیان کیا گیا ہے:

> ''اور ہم نے اُن (یہود) کے مابین قیامت تک کے لئے بغض وعناد ڈال دیا ہے، جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اسے بجھا ڈالتا ہے اور وہ زمین میں فساد مچانے کے لئے دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہیں اور اللہ فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (المائدہ:64)

مذکورہ بالا آیہ مبارکہ کے اس حصہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہودی بنیادی طور پر ایک فتنہ و فساد پیدا کرنے والی اور جنگوں کی آگ بھڑکانے والی قوم ہے جس کی بھرپور تائید اس قوم کے بھیانک تاریخی کردار سے بھی ہوتی ہے۔ عیسائیوں کی باہمی چپقلش ہو یا مسلمانوں کی باہمی لڑائیاں، صلیبی یلغار ہو یا تاتاری فتنہ، ان تمام واقعات میں کسی نہ کسی انداز میں یہودی ہاتھ ضرور کارفرما نظر آتے ہیں۔ حالیہ دور میں جنگ عظیم اوّل ہو یا دوم، امریکا اور روس کے مابین سرد جنگ ہو یا پھر موجودہ نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ، سبھی واقعات میں یہودیوں کا کوئی نہ کوئی گروہ ملوث

دکھائی دیتا ہے۔ازروئے قرآن چونکہ یہودیوں کے مابین ہمیشہ کے لئے بغض وعناد ڈال دیا گیا ہے لہٰذا جب ان کا کوئی گروہ اپنے مفادات کی خاطر زمین میں کہیں فتنہ وفساد اور جنگ کی آگ بھڑکاتا ہے تو اُنہی کا کوئی دوسرا گروہ مشیت ایزدی کے تحت اسے ٹھنڈا کرنے میں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ملوث دکھائی دیتا ہے۔اس کی واضح مثال حالیہ دور میں سوشلزم اور کیپٹل ازم کی جنگ بھی ہے۔ سوشلزم کا نظریہ ایک یہودی کارل مارکس نے پیش کیا تھا جس کی بنیاد پر اوّلین انقلاب روس میں آیا تھا اور اس انقلاب کے روح رواں لینن اور ٹراٹسکی وغیرہ بیشتر یہودی تھے۔اس سوشلزم کو سب سے زیادہ مزاحمت کا سامنا اُس سرمایہ دار بلاک کی طرف سے کرنا پڑا تھا جس کی باگ ڈور بھی یہودی ساہوکاروں کے ہاتھوں میں تھی۔ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ ہجرتِ نبوی ﷺ سے قبل یہود کے تین قبائل مدینہ منورہ میں آباد تھے مگر یہ قبائل اسلام کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے میں ناکام رہے تھے اور ایک ایک کر کے مسلمانوں کے رستے سے ہٹتے چلے گئے تھے۔

یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ دور حاضر کے یہودیوں کی ایک بڑی تعداد بھی، موجودہ صہیونی ریاست کے قیام کو درست نہیں سمجھتی ہے یا پھر اسے اپنی امنگوں و معیارات کے مطابق نہیں پاتی ہے۔لہٰذا عین ممکن ہے کہ مستقبل میں انہی لوگوں کا طرز عمل و پالیسیاں، موجودہ اسرائیلی ریاست کے خاتمے یا ناکامی کی ایک بڑی وجہ قرار پائے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہودیوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے اُن پر ہمیشہ کے لئے ذلت اور محتاجی کا عذاب تھوپا جا چکا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

> ''اُن (یہود) پر ذلت کی مار مسلط ہوگئی جہاں کہیں بھی وہ پائے جائیں مگر یہ کہ پناہ میں آجائیں اللہ کی اور یا پناہ میں آجائیں انسانوں میں سے کسی (گروہ) کی۔اور اُن پر محتاجی مسلط کر دی گئی بسبب اس کے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے، بسبب اس کے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھ جانے والے تھے۔'' (آل عمران:112)

اس آیہ مبارکہ پر غور کریں تو علامہ اقبال کا فرمودہ ''فرنگ کی رگِ جان پنجۂ یہود میں ہے''، مبالغہ پر مشتمل دکھائی دیتا ہے کیونکہ یہودی اپنی آبادی یا فوجی قوت کی بناء پر کبھی بھی اس قابل نہیں

رہے کہ وہ کسی دوسری قوم پر غلبہ پاسکیں۔اُن کی تمام تر کامیابیوں کا دارومدار اُن کی سازشی ذہنیت اور سرمایہ کے بل بوتے پر رہا ہے جبکہ وہ اقوام جو یہودیوں کے ہاتھوں مغلوب ہوئیں یا اُن کے زیر اثر آئیں، محض اپنی کمزوریوں کا نشانہ بنیں۔امریکا اور برطانیہ وغیرہ کے متعلق یہ عمومی خیال کہ وہ یہودیوں کے ہاتھوں یرغمال بن چکے ہیں، ایک حد تک ہی درست قرار دیا جاسکتا ہے۔درحقیقت یہودیوں کے کثیر و بے مایہ مادی و علمی سرمائے سے استفادے کی ضرورت وخواہش نے اُنہیں یہودیوں کا دست نگر بنا رکھا ہے۔

جہاں تک برطانیہ، یورپ اور امریکا کی حمایت سے مشرق وسطی میں اسرائیلی ریاست کے قیام اور اس کے تحفظ کی سامراجی پالیسیوں کا تعلق ہے تو ان کے پیچھے کئی مقاصد کارفرما نظر آتے ہیں جن میں سے اہم ترین مقصد عرب ممالک کو اپنے قابو میں رکھنا اور ان کے معدنی وسائل سے بھرپور استحصال کی خواہش ہے۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے سامراجی قوتوں نے یہ پالیسی اب تک بہت کامیابی کے ساتھ اختیار کی ہوئی ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے سیکولر و لبرل مزاج حکمران طبقات کو اپنا ہم خیال و اتحادی بنائے رکھو اور اُنہیں اپنی صفوں میں موجود بنیاد پرست طبقات سے ڈراتے رہو تاکہ اُن کے استعماری عزائم و مفادات بلا روک ٹوک پورے ہوتے رہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب و معاشروں (بشمول اُمت یہود اور اُمت مسلمہ) کے اندر راسخ العقیدہ لوگوں کے ایسے گروہ موجود ہوتے ہیں جنہیں جدید مغربی اصطلاح میں ''بنیاد پرست'' کا نام دیا گیا ہے۔یہ وہ گروہ ہیں جو ایسی مذہبی ریاستوں کے قیام پر یقین رکھتے ہیں جہاں اُن کی مخصوص مذہبی تعلیمات و روایات کا ہی سکہ چلتا ہو۔ان سیکولر اور بنیاد پرست طبقات کے درمیان ایک مسلسل کشاکش جاری ہے جس کا نتیجہ اسلامی روایات اور دیگر آثار و قرائن کی رو سے بالآخر بنیاد پرست طبقات کے غلبہ کی صورت میں برآمد ہوگا۔

جہاں تک اُمت مسلمہ کا تعلق ہے تو ہم اُن روایات سے بخوبی واقف ہیں جن میں دو مرتبہ ایسے نظام خلافت کے قیام کی بشارت دی گئی ہے جو عین اسلامی اصولوں پر استوار ہوگا۔

ان میں سے پہلا دور، حضرات خلفائے راشدین j کا تھا جبکہ دوسرا مثالی دور،

ان شاءاللہ العزیز مستقبل قریب میں آنے کی توقع کی جارہی ہے۔

جس طرح احادیث نبویہ c میں صحابہ کرام j اور اُمت مسلمہ کو دومرتبہ خلافت علی منہاج النبوّۃ کے قیام یا باالفاظ دیگر ایک حقیقی وعظیم غلبہ وکامرانی کی خوشخبری دی گئی تھی، اُسی طرح قبل ازیں بنی اسرائیل کو بھی اُن کی الہامی کتب میں دو ہی بار غلبۂ عظیم حاصل ہونے کی بشارت دی گئی تھی، جس کا تذکرہ قرآن حکیم میں اس طرح سے کیا گیا ہے:

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو اُن کی کتاب میں اس فیصلہ سے آگاہ کر دیا تھا کہ تم ضرور زمین میں دومرتبہ فساد برپا کروگے اور تم (دو ہی مرتبہ زمین میں) ضرور غلبۂ عظیم (بھی) حاصل کروگے۔ پھر جب اُن میں سے پہلے وعدہ کا وقت آ گیا، تو ہم نے تم پر اپنے ایسے بندے مسلط کر دیے جو سخت جنگجو تھے، پس وہ تمہارے گھروں میں پھیل گئے اور اللہ کا (پہلا) وعدہ پورا ہو گیا۔ پھر ہم نے اُن پر تمہاری باری لوٹا دی (یعنی اُن پر تمہیں غالب کر دیا) اور ہم نے تمہاری اموال اور اولاد سے مدد کی اور تمہیں گروہ کثیر بنا دیا۔ اگر تم نے بھلائی کی تو اپنی جانوں کے لئے کی اور اگر تم نے برائی کمائی تو اپنی ہی جانوں کے لئے کمائی، پس جب دوسرے وعدے کا وقت آ گیا (تو دوبارہ ہم نے تمہارے اوپر اپنے بندے مسلط کر دیے) تاکہ وہ تمہارے چہروں کو بگاڑ ڈالیں اور مسجد (اقصیٰ) میں داخل ہو جائیں جیسا کہ وہ پہلی بار اُس میں داخل ہوئے تھے اور تاکہ وہ ہر اُس چیز کو بری طرح تباہ و برباد کر ڈالیں جس پر غلبہ پائیں۔ بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر (ایک بار پھر) رحم فرمائے اور اگر تم دوبارہ ایسا کروگے تو ہم بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی (سلوک) کریں گے، اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے ایک قید خانہ بنا رکھا ہے۔'' (سورہ بنی اسرائیل 4-8)

مذکورہ بالا آیات قرآنی میں بنی اسرائیل کے متعلق بیان کی گئی پیشگوئیوں کی تشریح کے حوالے سے اگرچہ مفسرین کی آرا میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے تاہم ذیل میں بیان کی جانے والی تشریح کو اچھوتا تو قرار دیا جاسکتا ہے مگر امید واثق ہے کہ اسے غیر مدلل اور غیر متوازن قرار دے کر ردّ نہیں کیا جاسکے گا:

(1) افراد کی زندگیوں کی طرح اقوام کی زندگیوں کا بھی ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کے متعلق مذکورہ بالا دونوں پیشگوئیوں کی تکمیل کے عرصہ کو اس قوم کی پوری زندگی (حضرت موسیٰ d سے لے کر حضرت عیسیٰ d کے آسمان سے نزول) تک وسعت پذیر سمجھنا زیادہ مناسب ہوگا نہ کہ حضرت عیسیٰ d کے رفع آسمانی تک، جیسا کہ بالعموم ایسا کیا گیا ہے اور دونوں وعدوں کے پایہ تکمیل تک پہنچ جانے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ ان پیشگوئیوں کو بنی اسرائیل کی حیات کلی تک محیط سمجھا جائے تو اُن کے متعلق دوسرے وعدے کی تکمیل ہنوز باقی ہے۔

(2) بنی اسرائیل کی طرف سے دومرتبہ زمین میں فساد مچانے اور دوبار غلبہ وسربلندی حاصل کرنے سے اصل مراد عظیم ترین غلبہ وسربلندی حاصل کرنا ہی ہے کیونکہ بالعموم کسی قوم کو حاصل ہونے والا غلبہ واقتدار بالآخر اُس کے فساد فی الارض پر ہی منتج ہوا کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کے حوالے سے فساد فی الارض کو مقدم کر کے بیان کرنے کی ایک وجہ اس قوم کی فسادی، عیارانہ اور سازشی ذہنیت ہے اور موجودہ دور میں اُنہیں حاصل ہونے والے عالمی غلبے وسربلندی کو تو اسی ذہنیت کا مرہون منت قرار دیا جاسکتا ہے۔ بنی اسرائیل کو جو عظیم الشان ترقی، رفعت اور سربلندی حضرت داؤد d وحضرت سلیمان d وغیرہم کے دور میں حاصل ہوئی تھی، ویسی اگر دوبارہ حاصل ہوسکتی ہے تو وہ صرف موجودہ دور ہی کہا جاسکتا ہے۔ پہلے دور میں اُنہیں یہ سربلندی، دینی و روحانی علوم میں ترقی کی بدولت حاصل ہوئی تھی جبکہ دورِ حاضر میں اُن کے غلبے کی بڑی وجہ مادی و سائنسی علوم میں دوسری تمام اقوام سے سبقت لے جانا ہے کیونکہ دور حاضر کی حیرت انگیز ترقی میں یہودی سائنسدانوں ودانشوروں کا کردار کلیدی اہمیت کا حامل رہا ہے۔

ایک رائے کے مطابق مکابی سلطنت کے قیام کی صورت میں بنی اسرائیل کو دوسری بار غلبہ وسربلندی حاصل ہو چکا ہے اور اُن کے اس غلبے کا خاتمہ 70ء میں ٹائٹس رومی کے ہاتھوں شکست اور بیت المقدس کی بربادی کی صورت میں ہوگیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو کامل شکست اسلام کے ابتدائی دور میں ممکن ہوسکی تھی کیونکہ قبل ازیں وہ کسی نہ کسی انداز میں اقتدار اور اثر ورسوخ کے حامل رہے تھے جس کی واضح مثالیں یمن، خیبر اور مدینہ وغیرہ میں اُن کے مضبوط مراکز وگہرے اثر ورسوخ کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اگر بنی اسرائیل کو ''وعدہ الٰہی'' کے مطابق دوسری بار بھی غلبہ وسربلندی حاصل ہوجانے کا کامل یقین ہو چکا ہوتا تو یہ قوم کب کی مٹ چکی ہوتی۔ اس قوم کی تاریخ چار ہزار سال سے زائد ہے۔ اس طویل عرصہ کے دوران کتنی ہی اقوام عروج کے زینے پر چڑھیں اور فنا کے گھاٹ اُتر گئیں مگر بنی اسرائیل کو نیست و نابود کرنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود اسے ختم نہ کیا جا سکا۔ اس کی اہم ترین وجہ دوبارہ عروج و غلبے کا وہ یقین وخواہش ہی ہے جو اُن کی مذہبی روایات میں ایک مسیحا یا نجات دہندہ کی آمد کی خبروں سے پھوٹتی ہے۔

جہاں تک اس قوم کی طرف سے دومرتبہ عظیم ترین فساد فی الارض برپا کرنے کا تعلق ہے تو اُن کا پہلا فسادِ عظیم، اپنی طرف مبعوث ہونے عظیم رسول اور آیات اللہ میں سے ایک عظیم آیت (یعنی حضرت عیسیٰ d) کی تکذیب بلکہ اُنہیں سولی پر چڑھانے کی کوشش کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن کے اس دور فساد کو نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کی تکذیب اور اُنہیں قتل کرنے کی کوششوں تک بھی وسعت پذیر سمجھا جا سکتا ہے۔ اُن کا دوسرا فسادِ عظیم، موجودہ دور میں جاری وساری ہے جو خروج دجال ویاجوج ماجوج کے وقت اپنے نقطہ کمال کو پہنچ جائے گا۔ حضرت مسیح d کے آسمان سے دوبارہ نزول کے بعد بھی جو لوگ راہ راست پر نہ آئیں گے، وہی بدترین مفسد شمار ہوں گے جنہیں (از روئے احادیث) قتل کر دیا جائے گا۔

(3) ''پھر ہم نے اُن پر تمہاری باری لوٹا دی'' کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو قوم پہلے فسادِ عظیم کے دوران یہودیوں پر غلبہ پائے گی، اُسی پر ہی اُنہیں دوبارہ غلبہ عطا کیا جائے گا۔ یہ تاریخی حقیقت بھی اُمت محمد ﷺ کے حوالے سے ہی صادق آتی ہے کیونکہ موجودہ دور میں قومِ یہود، اُمت مسلمہ پر بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر غلبہ پانے اور اپنا حساب چکانے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ یہودیوں پر سب سے پہلے اہلِ عراق نے بخت نصر کی قیادت میں غلبہ حاصل کیا تھا اور عراقیوں پر قومِ یہود کا دوبارہ غلبہ تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔ بعدازاں اہلِ روم نے یہودیوں پر غلبہ حاصل کیا تھا مگر اُن پر بھی یہودیوں کا دوبارہ غلبہ تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔ اگرچہ آج اُنہی اہلِ روم کے وارثوں پر یہودیوں کو بالواسطہ طور پر غلبہ واثر ورسوخ حاصل ہو چکا ہے مگر اُس وقت غالب ہونے والے رومیوں کا مذہب تو بت پرستی تھا جنہوں نے بعدازاں عیسائیت قبول کر لی

تھی۔اس معاملے کونسلی کی بجائے مذہبی حوالے سے ہی لینا چاہیے اور مذہبی حوالے سے یہ حقیقت اُمت مسلمہ پر ہی فٹ بیٹھتی ہے جس نے اُنہیں مدینہ اور خیبر میں شکست دینے کے بعد اُن کے قبلہ، بیت المقدس کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔آج یہودی نہ صرف اپنے قبلہ پر قبضہ کر چکے ہیں بلکہ بین القوامی اداروں کے ذریعے بالواسطہ طور پر مسلمانوں پر حاوی بھی ہو چکے ہیں۔

مزید برآں پہلے وعدہ کے وقت بنی اسرائیل پر غالب آنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ''اپنے بندے'' قرار دیا ہے جس پر بھی غور کیا جانا ضروری ہے۔ہم جانتے ہیں کہ سورہ بنی اسرائیل (جس کا دوسرا نام سورۃ الاسراء بھی ہے) کا آغاز ہی واقعہ اسراء سے ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو ''عبـــدہ'' یعنی اپنا خاص بندہ قرار دیتا ہے۔اس تناظر میں رسول اللہ ﷺ اور اُن کے صحابہ کرام j ہی اللہ کے وہ خاص، پسندیدہ و مقرب بندے ہیں جن پر ''عبـــادًا لنـــا'' کے الفاظ سو فی صد فٹ بیٹھتے ہیں۔کسی کافر قوم کے لئے یہ الفاظ زیب نہیں دیتے ہیں اور اس حقیقت سے ہم بخوبی واقف ہیں کہ صحابہ کرام j نے مدینہ، خیبر اور بیت المقدس سمیت ہر اُس علاقے پر اپنی عملداری کامیابی سے قائم کر لی تھی جو کبھی بنی اسرائیل کے زیرِ تصرف رہے تھے۔گویا الفاظِ قرآنی کے عین مطابق وہ (صحابہ کرام) بنی اسرائیل کے گھروں میں پھیل گئے تھے (یعنی اُن کے تمام علاقوں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا)۔

(4) مذکورہ بالا آیات میں بیان کیے گئے ''دوسرے وعدہِ الٰہی'' کی تکمیل کے وقت جو قوم کامیابی کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں داخل ہوگی، وہ اس سے قبل بھی مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کو فتح کرنے کا اعزاز حاصل کر چکی ہوگی۔یہ حقیقت بھی صرف اہل اسلام پر صادق آتی ہے جنہوں نے پہلی بار حضرت عمر فاروق h کے دور میں بغیر جنگ کے بیت المقدس کا کنٹرول حاصل کیا تھا اور از روئے احادیث آئندہ بھی ان شاء اللہ اسے پر امن انداز میں فتح کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ان احادیث میں سے مشہور ترین حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ ''خراسان سے سیاہ پرچم نکلیں گے جنہیں کوئی چیز نہ روک سکے گی یہاں تک کہ وہ ایلیاہ (بیت المقدس کا پرانا نام) میں نصب ہو جائیں گے۔'' (عن ابی ہریرہؓ، رواہ الترمذی)

اگرچہ حدیث میں وارد سیاہ پرچموں کے الفاظ کی وجہ سے بے شمار جماعتوں و گروہوں

نے سیاہ رنگ کے پرچم اختیار کر لیے ہیں تاہم ان کی حقیقت وقت آنے پر ہی پتہ چل سکے گی۔

(5) دوسرے وعدۂ الٰہی کی تکمیل کے متعلق ایک اور قابل غور حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت نہ صرف بہت زیادہ تباہی و بربادی ہوگی بلکہ یہودیوں کے چہرے بھی مسخ کر دیے جائیں گے۔اس حقیقت پر غور کرنے سے ممکنہ طور پر پیدا ہونے والی اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ہو جانا چاہیے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی m نے دوسری مرتبہ بیت المقدس فتح کر کے مسلمانوں سے اس وعدہ الٰہی کی تکمیل کر دی تھی۔حقیقت یہ ہے کہ دورانِ جنگ چہرے مسخ ہو جانے کا کوئی واقعہ یہودیوں کی تاریخ میں کبھی رونما ہوا ہے اور نہ ہی ماضی میں عملاً ایسا ممکن تھا البتہ اسے مستقبل کی ایک ایسی جنگ کی پیشگوئی ضرور کہا جا سکتا ہے جس میں نہ صرف بہت زیادہ تباہی ہوگی بلکہ لوگوں کی شکلیں بگاڑ دینے والے ہلاکت آفریں ایٹمی یا کیمیائی ہتھیار استعمال ہوں گے۔بائبل اور اسلامی روایات کی رو سے ہم جانتے ہی ہیں کہ ارضِ فلسطین میں ایک عظیم ترین جنگ یعنی ''الملحمۃ العظمیٰ'' وقوع پذیر ہوگی جسے اہلِ کتاب کی روایات میں ہرمجدون یا آرمیگاڈون کا نام دیا گیا ہے۔ممکنہ طور پر اس جنگ کے فریق مسلمان، عیسائی اور یہودی ہوں گے اور بیت المقدس (یروشلم) ایک ایسا شہر ہے جسے ان تینوں مذاہب کے پیروکار اپنے لئے مقدس و متبرک سمجھتے ہیں۔اگرچہ روایات سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ آیا بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ اس جنگ عظیم کے نتیجہ میں بحال ہو سکے گا یا پھر یہ جنگ بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضے کے ردعمل میں ہی پیش آئے گی تاہم اُس جنگ کے نتیجے میں موجودہ صہیونی ریاست کا خاتمہ ایک یقینی امر ہوگا۔اس حقیقت کی طرف اشارہ اُن احادیث سے بھی ہوتا ہے، جو ظاہر کرتی ہیں کہ اس جنگ کے بعد اسلامی افواج پیش قدمی کرتے ہوئے قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) پر اپنا کنٹرول قائم کریں گی جو غالباً اُس وقت یورپی افواج کے زیر اثر آ چکا ہوگا۔

باقی جہاں تک المسیح الدجال کے ہاتھوں یہودی ریاست کے قیام کا تعلق ہے تو دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا ظہور فتح قسطنطنیہ کے بعد عراق یا ایران کے کسی علاقے سے ہوگا کیونکہ ایک روایت کے مطابق ایرانی شہر، اصفہان کے یہودی اُس کے اوّلین پیروکار و مددگار ہوں گے۔اس علاقے سے خروجِ دجال کے امکان کی تائید نہ صرف موجودہ زمینی حقائق سے ہوتی ہے بلکہ مستقبل میں حضرتِ مہدی کے ذریعے قائم ہونے والی اسلامی خلافت کا قیام بھی، اسی

امکان کی نشاندہی کرتا ہے۔ زمینی حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مشرق وسطی میں اسرائیل کے بعد یہودیوں کی سب سے زیادہ تعداد ایران میں بستی ہے جبکہ مستقبل کی بدیہی حقیقت یہ ہے کہ حضرت مہدی کی اسلامی خلافت، اس علاقے میں بسنے والے اکثریتی، اثناعشری فرقے کے تصورات و نظریات سے متصادم ہوگی۔ اس خطے میں دجالی ریاست کا قیام، اثناعشری فرقے کی تائید وحمایت اور عملی تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ امام غائب کے مہمل تصور کی وجہ سے اس فرقے کے لوگوں کی طرف سے، اچانک رونما ہونے والے کسی رہنما، کو اپنا مطاع بنالینا کوئی ایسی بعید و ناممکن بات بھی نہیں ہے۔ احادیث میں دجال کے یہودی النسل ہونے کی خبر ضرور ہے مگر یہ ثابت نہیں کہ وہ صرف یہودیت کا علمبردار ہوگا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھیوں اور پشت پناہی کرنے والوں میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوں گے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ حضرت مہدی کی خلافت کے مقابلے میں اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ہی منظر عام پر آئے گا اگرچہ وہ بین المذاہب ہم آہنگی و مفاہمت کا علمبردار بھی ہوگا۔ یہ کوئی ایسی انہونی و بعید از عقل بات بھی نہیں ہے کیونکہ دشمنی ومنافرت کی سیاست کو زیادہ عرصے تک پذیرائی نہیں ملا کرتی۔

''بدلتا ہے آسمان رنگ کیسے کیسے'' کے مصداق کیا آج ہمارے ملک پاکستان میں تقسیم ونفرت کی سیاست کرنے والی جماعتیں، مفاہمت وقومی یکجہتی کی پرچارک نہیں بن چکی ہیں؟ بہرکیف ایران وعراق کے علاقے میں یہودیوں کی بڑے پیمانے پر موجودگی و اثر ورسوخ اور مستقبل کی اسلامی خلافت کے متعلق اثناعشری فرقے کا ممکنہ معاندانہ رویہ، یہ دو ایسے بڑے زمینی حقائق ہیں، جن کی بناء پر اس خطے میں مسیح دجال کی زیر قیادت دجالی ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہو سکے گی۔ اسی سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ موجودہ صہیونی ریاست کے خاتمے میں یہودیوں (بالخصوص اس علاقے میں رہنے والوں کا) ایک گروہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اپنا کردار ضرور ادا کرے گا یعنی سورۃ المائدہ کی آیت 64 میں بیان کیا گیا، یہودیوں کا باہمی بغض وعناد بھی موجودہ صہیونی ریاست کے خاتمے کا ایک سبب ہوگا۔ یہودیوں کی تاریخ بالخصوص نبی کریم ﷺ کے دور میں یہودیوں کا مجموعی طرز عمل بھی اسی حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ اگر اُس وقت مدینہ میں بسنے والے یہودی اسلام کے خلاف متحد ہونے کی بجائے، ایک ایک کر کے شکست فاش

سے دوچار ہوئے تھے تو آج دنیا بھر میں بکھرے ہوئے یہودیوں کا ایک ہی ایجنڈے پر کامل اتفاق کیونکر ممکن ہے؟ اگر آج مسلمان باہم دست وگریبان ہو رہے ہیں تو کوئی اور قوم کیوں نہیں ہوسکتی؟

آخر میں ہم قارئین کو اس خطے میں پیش آنے والے ماضی قریب کے دو واقعات پر غور و فکر کی دعوت بھی دیئے جاتے ہیں۔ پہلا واقعہ ایران عراق جنگ کے متعلق ہے جس کے متعلق حال ہی میں یہ انکشاف سامنے آیا ہے کہ عراق کی طرح ایران کو بھی اسلحہ (بالواسطہ طور پر) امریکہ سے ہی آتا رہا تھا۔ یہ کام یقیناً یہودیوں کا کوئی مضبوط مافیا ہی سرانجام دیتا رہا ہوگا۔ دوسرا واقعہ لبنان کی حزب اللہ ملیشیا اور اسرائیل کی جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جنگ کے دوران امریکی و اسرائیلی حکومت کی طرف سے تواتر کے ساتھ یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ حزب اللہ ملیشیا کو اسلحہ، ایرانی حکومت فراہم کر رہی ہے۔ ایران کی سرحد لبنان کے ساتھ نہیں ملتی ہے تو پھر کڑی امریکی نگرانی اور پابندیوں کے باوجود ایرانی حکومت کے لئے ایسا کیونکر ممکن ہوسکتا تھا؟ یقیناً اس کارستانی کے پیچھے بھی یہودیوں کا وہی گروہ ملوث رہا ہوگا جو موجودہ صہیونی ریاست کو اپنے تصورات کے مطابق نہیں پاتا ہے اور اس کے خاتمے کا خواہاں ہے۔ اہل اسلام کی طرح روایات کی روشنی میں یہ یہودی گروہ بھی خوب جانتا ہے کہ مستقبل کی وسیع تر دجالی ریاست کے قیام کا آغاز ایران اور عراق کے علاقے سے ہوگا۔ سبھی جانتے ہیں کہ اسلام میں تشیع و رافضیّت کا بیج بونے میں یہودیوں کا کردار بنیادی نوعیت کا رہا ہے؛ لہٰذا مستقبل میں یہودیوں کے عزائم کی تکمیل میں بھی شیعہ اثنا عشری فرقہ کو مرکزی حیثیت ہو جانا زیادہ تعجب و اُچنبھے کی بات نہ ہوگی۔ بلاشبہ اہل بیت کے نام لیواؤں کے پاس ''مظلومیت کی چادر'' اور ''جذبۂ حریت'' کی ایسی عظیم میراث موجود ہے جسے کچھ غیر معمولی واقعات کے ذریعے مزید بڑھاوا دے کر مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کیا آج بھٹو خاندان کی ''مظلومیت'' اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے ''جیالا پن'' کو مفاد پرستوں کا ایک مضبوط ٹولہ کامیابی کے ساتھ کیش نہیں کروا رہا ہے؟ کیا یہودی، عیسائیوں کے پراٹسٹنٹ (protestent) فرقہ کو پچھلی کئی صدیوں سے اپنے مقاصد کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال نہیں کر رہے ہیں؟

حکمت بالغہ (ستمبر 2012ء) کی خصوصی اشاعت

یاجوج ماجوج نمبر

پر

اہل علم کی آراءوتاثرات

عبدالرشیدارشد جوہرآباد

ماہنامہ حکمت بالغہ کے فاضل مدیراعلیٰ جناب انجینئر مختار فاروقی صاحب یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں کہ کم وبیش تن تنہا انتہائی اہم عنوانات پر حکمت بالغہ کے خصوصی شمارے قارئین کے سامنے لاتے ہیں۔ ''ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بزرگ وبرتر'' گویا قرآن کریم کی برکت سے ان پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل واحسان ہے۔

ستمبر 2012ء کا شمارہ فاروقی صاحب نے حسب وعدہ یاجوج ماجوج کے لئے مختص کیا۔ 152 صفحات پر مشتمل اس وثیقہ میں فاضل مدیر نے نہ صرف قرآن وحدیث سے بلکہ مسلم اور غیر مسلم مفکرین کی تحقیق وآرا سے بھی بھرپور استفادہ کرتے یاجوج ماجوج سے متعلق انتہائی مفید تاریخی مواد جمع کردیا ہے۔ گویا یہ اپنے عنوان پر انسائیکلوپیڈیا کا ایک باب ہے، انتہائی قابل قدر باب۔

موجودہ دور کے بعض تحقیق کنندگان اس عنوان پر ممکن ہے ان مصادر تک کامل راہنمائی سے محروم رہتے جسے محترم فاروقی صاحب نے سہل الحصول بنادیا۔ قرآن وحدیث اور یہود و نصاریٰ کی آرا کی یکجائی اور فاروقی صاحب کے توضیحی اشارات یوں بات سمجھنے والوں کے لئے ہر قدم پر سہولت کا خصوصی اہتمام، اس شمارے کی امتیازی صفت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد m جیسے دیدہ وراور دور حاضر کے نوجوان محقق محمد انیس الرحمان کی تحریروں سے استفادہ، جناب فاروقی

صاحب کی وسعت قلب ونظر کا بین ثبوت ہے۔ سیّد مناظر احسن گیلانی کی فکر انگیز تحقیق سے بھی استفادہ شامل اشاعت ہے۔

ایک طرف فرامین رسالت مآب ﷺ ہیں جن میں یاجوج ماجوج کی نشانیاں اور قبل از قیامت خروج کا ذکر ہے تو دوسری طرف جدید تحقیق ہے جو یاجوج ماجوج کا رشتہ بنی اسرائیل کے بعض قبائل سے جوڑتی ہے اور ماضی میں تاتاریوں کی یلغار یا روسیوں کی ریشہ دوانیوں کو دورِ جدید کے یاجوج ماجوج ثابت کرتی ہے۔ حکمت بالغہ کے مطالعہ سے جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ دور حاضر میں اسرائیل وروسی شر کا پھیلاؤ دراصل آخری خروج کی شروعات ہیں اور وہ وقت قریب ہے جب عالمی سطح کی آخری جنگ جسے یہود جنگ ہرمجدون کہتے ہیں تو نصاریٰ تیسری عالمگیر جنگ اور جسے نبی مکرم ﷺ نے الملحمۃ الکبریٰ فرمایا: میں یہ یاجوج ماجوج قطار اندر قطار لپکیں گے۔

الملحمۃ الکبریٰ یا جنگ ہرمجدون کا علاقہ وہی بیان کیا جاتا ہے جہاں طبریہ کی جھیل اور زغر کا چشمہ ہے جس کا سارا پانی یہود کے مددگار روسی یاجوج ماجوج یا دوسرے امدادی ختم کر دیں گے۔ اس جنگ میں اگر واقعتاً طبریہ کی جھیل اور زغر کا چشمہ خشک ہوتے ہیں تو یہ نبی برحق ﷺ کے فرمان کی روشنی مین خروجِ دجال کا سبب بھی ہو گیا (بحوالہ بخاری ومسلم کتاب الفتن) اور نزولِ مسیح d ہوگا۔ اس طرح قرآن وحدیث میں بیان کردہ حقائق اور گزرتے ایام میں دیکھے جانے والی نسل یاجوج ماجوج اور اس کے طرز زندگی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم بالصواب

یاجوج ماجوج پر حکمت بالغہ کی خصوصی اشاعت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بعض حقائق کی وضاحت کے لئے فاضل مدیر نے نقشوں کا سہارا لیا ہے۔ قاری کو بات سمجھنے میں سہولت ملتی ہے اور کسی بھی جگہ تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ صفحہ نمبر 119 پر مولانا ابوالکلام آزاد m کی تحقیقی کاوش ''اصحاب کہف اور یاجوج ماجوج'' سے لیا گیا نقشہ موضوع کو سمجھنے میں خاصہ مددگار ہے۔ یاجوج ماجوج کی فطرت کا ایک پہلو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ جہاں جہاں سے گزریں گے ہر چیز تباہ برباد کرتے جائیں گے۔ ہمارے نزدیک یہ صرف یاجوج ماجوج ہی کی فطرت نہیں بلکہ یلغار کرنے والی ہر قوم کی فطرت ہے جس کی طرف ملکہ سبا نے بھی اپنے مصاحبین کے سامنے ذکر واشارہ کیا تھا جب انہوں

نے حضرت سلیمان d کے مقابلہ میں قوت استعمال کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ ملکہ کا کہنا تھا کہ ''جب کوئی لشکر آتا ہے تو ہر چیز کو تہہ و بالا کرتا ہے، عزت داروں کو بے عزت کرتا ہے'' یاجوج ماجوج کے آخری خروج کی اسی کیفیت کو طبریہ کی جھیل کا پانی پینے سے اور اس کے خشک ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

انجینئر مختار فاروقی صاحب قابل ستائش ہیں کہ ہر عنوان پر حکمت بالغہ کی خصوصی اشاعت مرتب کرتے اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت عمر دراز فرمائے تا کہ مسلم اُمہ ان کی صلاحیتوں پر بھرپور استفادہ کرتی رہے۔ آمین یارب العالمین۔

2۔ حافظ مختار احمد گوندل سابق ڈپٹی چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی لاہور

ماہنامہ حکمت بالغہ کا ''یاجوج ماجوج نمبر'' قرآن مقدس میں بیان کردہ تاریخی حقائق میں وہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا تذکرہ مذاہب ثلاثہ کے علاوہ دیگر سامی مذاہب میں بھی موجود ہے اور دینی رسائل و جرائد کے لئے ترغیب و رہنمائی بھی ہے کہ وہ بھی قرآنی معارف کی بیان کردہ تحقیقاتی راہوں پر گامزن ہو کر کرۂ ارضی پر قرآن پاک کی دی ہوئی معلومات کے مطابق رب کائنات کی دھرتی پر اسی رب ذوالجلال کے تشکیل کردہ نظام کے نفاذ کی کوششوں میں معاون بنیں۔ یہی اس خصوصی شمارہ کی اشاعت کا مطلوب ہے۔

قابل صد تحسین و تبریک ہیں برادرم انجینئر مختار فاروقی صاحب جن کی شب روز کاوشوں سے یہ خصوصی شمارہ منصۂ شہود پر آیا۔ وہ ہمیشہ ایسے موضوعات کی ٹوہ میں رہتے ہیں جن سے عالمی خلافت کے قیام کی راہیں ہموار ہو سکیں۔ خداوند متعال ان کی نیک خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

اس زیر مطالعہ خصوصی شمارہ کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں یاجوج ماجوج کے تذکرے، دوسرے باب میں روئے ارضی پر نسل انسانی کا پھلاؤ اور تیسرے باب میں منہ بولتے حقائق اور چند ضمنی باتیں شامل ہیں۔ اگرچہ یاجوج ماجوج کے اس شمارہ میں تفصیلی حقائق ملتے ہیں تاہم یاجوج ماجوج کی بہت سی مباحث ابھی تشنہ تحقیق ہیں قلمی معاونین اسے بارانِ علم و عرفان کا پہلا قطرہ تصور کریں اور یاجوج ماجوج اور سد ذوالقرنین کی بہت سی جغرافیائی معلومات جو تحقیق طلب ہیں ان پر خامہ فرسائی کریں۔ جیسا کہ قومِ نوح، طوفانِ نوح اور کشتی نوح d کے

بارے میں فراوان تحقیقات دستیاب ہیں اس سلسلہ میں راقم کی تجویز یہ ہے کہ ''انبیاے کرام f
کی پیش گوئیوں'' کو آئندہ کسی خصوصی شمارہ کا خصوصی موضوع بنایا جائے۔

دوسرے باب میں تشکیل انسانیت اور روئے ارضی پر انسانی عروج وزوال کی داستان رقم ہے۔تیسرا باب ان حقائق پر مشتمل ہے جسے سابقہ دوابواب کی تحقیقات کا ماحصل بھی کہا جاسکتا ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ اوران کی تحقیق آج کے دور کا اہم موضوع ہے۔اس وجہ سے بھی کہ صہیونیت نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا جو آج امن عالم کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن چکی ہے۔ دنیا میں کسی جگہ بھی دہشت گردی ہو اس کے پس منظر میں صہیونی قوتیں اور سازشیں کارفرما ہوتی ہیں، جس کا بالتفصیل تذکرہ اس میں کیا گیا ہے۔گویا شمارہ یاجوج ماجوج اور سد ذوالقرنین کے حوالہ سے ایک معلوماتی انسائیکلو پیڈیا کی ہے تاہم اگر اس میں WEBLIOGRAPHY اور مصادر ومنابع کا اضافہ کردیا جائے تو اسے علیحدہ کتابی صورت میں بھی شائع کیا جاسکتا ہے۔

حکمت بالغہ ان تحقیقی رسائل وجرائد میں اپنی جگہ بنا چکا ہے جن کے سنجیدہ قارئین کا وسیع حلقہ اندرونِ ملک کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی موجود ہے اور یہ خصوصی شمارہ ان کے لیے ایک نعمت عظمیٰ سے کم نہیں۔ یہ ایک ایسا تحقیقی موضوع ہے جس پر مزید مضامین ومقالات جمع کر کے انہیں علیحدہ کتابی صورت میں قارئین کے لئے مزید معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ.....

اپنے نام اور اپنے دوستوں کے نام رسالہ جاری کروا کر

ماہنامہ حکمت بالغہ کے مشن میں تعاون کریں

تاحیات رسالہ کے اجراء کے لیے

زرتعاون پندرہ ہزار روپے یکمشت

سالانہ اجراء کے لیے-/350 روپے صرف

فی پرچہ 35 روپے صرف

اہل یورپ وامریکہ کی فکری بددیانتی

(گل شیر بٹ) (روزنامہ نوائے وقت لاہور 12-10-2012)

آسٹریا کی انزبرُک ریجنل کورٹ نے بی بی مریم g کے حوالے سے بننے والی فلم SATIRICAL TRAGEDY بین کر دی جبکہ فلم کے پروڈیوسر نے یورپین کنونشن کے آرٹیکل 10 کے تحت دی گئی آزادی اظہار کے تحت یورپین کورٹ فار ہیومن رائٹس سے رجوع کیا کہ فلم سے پابندی اٹھائی جائے۔ یورپین کورٹ نے فلم مذکورہ پر ''دوسروں کی مذہبی آزادی میں مداخلت'' اور برداشت کی روح کے منافی ہے کی بنیاد پر ریجنل کورٹ کی پابندی کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ اسی طرح برطانیہ میں بننے والی فلم VISIONS OF ECSTASY میں حضرت عیسیٰ d اور بائبل کے متعلق ہتک آمیز مواد شامل کیا گیا۔ یورپین کورٹ نے اس فلم کی ڈسٹری بیوشن پر پابندی کو جائز قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ فلم عیسائیوں کے حقوق کے تحفظ کے منافی ہے۔ دونوں صورتوں میں آزادی اظہار کے حق کو دوسروں کی مذہبی آزادی میں مداخلت کی بنیاد پر تسلیم نہ کر کے کروڑوں عیسائیوں کو دل آزادی سے بچا کر ان کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔

دوسری طرف ڈنمارک میں توہین آمیز خاکے شائع کئے جاتے ہیں۔ فیس بک پر توہین آمیز خاکوں کا مقابلہ کروا کر کروڑوں مسلمانوں کی دل آزادی کا سامان اور اہتمام کیا جاتا ہے۔ دکھ کی بات ہے کہ اہل یورپ اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں مصروف ہیں اور ہم غلامانہ سوچ اور چند مفادات کی خاطر سچ کے اظہار کی قوت سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ ہم نے اسلام کے خلاف بات کرنے کو پڑھا لکھا ہونے کی دلیل بنا لیا ہے۔ کوئی سوال کرنے والا ہی نہیں رہا کہ ہولوکاسٹ اگر جرم ہے تو نبی کریم ﷺ کی توہین جرم کیوں نہیں۔ دراصل وہ بھول جاتے ہیں کہ برابری اور مساوات کے پرچارک اہل یورپ اور امریکہ نے آزادی اظہار رائے اور اس کی تشریح کا حق صرف اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سنڈی لی گارشیا کی طرف سے حالیہ متنازعہ فلم دکھانے کیلئے یوٹیوب پر پابندی کی بابت گزاری گئی درخواست لاس اینجلس کی سپریئر کورٹ جج لوئس لیون کی طرف سے مسترد نہ ہوتی۔۔۔۔۔۔۔ دوسری طرف ہم ذہنی اور فکری طور پر اس قدر ضعیف ہو گئے ہیں کہ توہین رسالت کو بین الاقوامی قوانین کا حصہ بنوانا تو بہت دور کی بات ''یوم عشق رسول'' منانے کا ڈھنگ بھی نہیں سیکھ پائے۔ ہم ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ دنیا کو اسلام دشمنوں کے جھوٹ پر بھی سچ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ہم اپنی کمزوریوں کو کچھ ایسے چھپاتے ہیں کہ یہ سب اسلام کے دشمنوں نے کروایا ہے۔ انہوں نے عمارتیں جلائیں اور بینک لوٹے، اس طرح بالواسطہ ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم میں ابھی دشمنوں کی کاروائیوں کا جواب دینے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی!

THE HARMAIN ARE US TARGET

US INCULCATES HATE INTO ITS MILITARY

Dr. S. Ausaf Saied Vasfi

What is the degree of hate against Islam and Muslims, inculcated systematically into the minds and hearts of the American government, civilians and military officials? Does the United States, or, to be exact, did the United States do so officially?

A 300-word story, datelined Washington, May 11, done by the Associated Press, reveals:

> "A course for US military officers has been teaching that America's enemy is Islam in general, not just terrorists, and suggesting that the country might ultimately have to obliterate the Islamic holy cities of Makkah and Madinah without regard for civilians, following precedents such as of nuclear attack on Hiroshima."

The story referred to above is from the proverbial horse's mouth. Reverting to the subject, to quote its other key points by a top military officer:

POSSIBLE OUTCOMES:

"They hate everything you stand for and will never exist with you, unless you submit, " inspector Army Lt. Col. Matthew Dooley said last July at Joint Forces Staff College in Northfolk, Virginia. Dooley also presumed for the purpose of

this theoretical war plan that the Geneva Convention was "no longer relevant".

He added: "This would leave open the option once again of talking war to a civilian population whenever necessary (the historical precedents of Dresden, Tokyo, Hiroshima, and Nagasaki being applicable)." His war plan suggested possible outcomes such as "Saudi Arabia threatened with starvation….. Islam reduced to cult status" and the Muslims holy cities of Makkah and Madinah in Saudi Arabia "destroyed".

A copy of the presentation was posted online by Wired.com's Danger Room blog. A Pentagon spokesman authenticated the documents. Dooley still works for the college, but is no longer teaching, Chairman of Joint Chiefs of Staff Gen. Martin Dempsey said.

TALKING POINTS

The course "Perspectives on Islam and Islamic Radicalism" was an elective taught since 2004. It was offered five times a year with about 20 students each time. For the sake of clarity, we enumerate below the talking points of the story:

1) It is not only the Muslim terrorists but Islam as an ideology or religion that is the enemy of the United States. Therefore, with a view to getting rid of the foe, the erasal of the two holy shrines in Makkah and Madinah from the surface of the soil is also necessary. Let the US military should not attach undue importance to the destruction of human life, as collateral damages are understandable in an all-out war, as the world saw in a Hiroshima-like situation without which the "menace" of Islam cannot be dealt with effectively.

2) Islam and Christianity or Judaism can not live amicably, side by side. For the survival of the later, liquidation of the former is a must.

3) The international covenants like the Geneva Convention should not bother the conscience of the US military. In such cases, they seize to be relevant.

4) If taking war to the civilian populaces becomes necessary, it should be taken confidently. There are precedents to justify the American action, like Dresden, Tokyo, Hiroshima and Nagasaki.

5) The possible outcomes like starvation deaths of the Saudis, assumption of the cult status of Islam or destruction of Ka'ba or Masjid Al-Nabvi should not deter the American bombers.

Like Hitler's "final solution" this is America's final solution, which, if you go deeper, smacks of the Zionist thinking and strategy.

That this course has now been suspended is not the news. The news is that the hideous face of Pentagon, representing the anti-Islamic sentiment among the Christian and Jewish brethren has been unmasked once again.

CRUSADES CONTINUE?

Side news is that the Kansas Senate, not long ago, has approved a bill that effectively obliterates the Islamic Shariah in the State. The number of yes-votes was 34 while the no-votes were only four. This should not distract our attention from the central point, which is that the unipolar United States is, and has been, at war with Islam. The logical inference of this belligerent strategy is that an American soldier must know that wherever he is fighting or is going to fight in the future he must consider his fight as against Islam. In brief and simple words, it means the crusades continue, and continue unabated. It is clear that in this Christian Zionist jihad, the US, the UK and the entire Europe are united. The difference lies in degree alone.In this disquieting backdrop let the US Defence Secretary, Foreign

Secretary and Secretary for Information think coolly what repercussion they expect from the Arab Islamic world for letting out the said secret. Do they think the Muslims in general would take it in stride?

The heady wine of power seems to have totally blinded the already purblind US administration's egg-headed leadership. Has nobody read history there? Where are the Pharaohs today? Don't go far. Where is Hitler? Did it ever occur to the Fuehrer that one day he could commit suicide in a bunker in St. Helina? Were these insignificant footnotes in history not more powerful in their times than the Pentagon, the US and its partners in crimes against humanity?

The explicit threat to the Harman painfully compels Muslims in general and their leadership in particular to ask the Guardian of the two Holy Mosques: How does he propose to confront the bellicose America? An onerous responsibility rests on his shoulders. Perhaps the Saudi King Knows that the Islamic world as a whole does not feel at ease, much less enthusiastic about the Saudi extraordinary proximity with the United States because of the latter's irrational and unhelpful attitude towards the transplanted Israel. Being what he is, King Abdullah is expected to care for his co-religionist's responsibility.

There is no mechanism in the entire West Asian region as well as North Africa that may provide some semblance of hope or relief. The much-touted OIC has been reduced to the status of a debating society, heavily punctuated with verbosity. Our morbid feeling is that all the His Majesties, His Highnesses and His Excellencies hang together urgently before they are hanged together by the United States of America.

(بشکریہ ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور، ستمبر 12، شمارہ 35)

کیا آپ جانتے ہیں؟

☆ ذوالقرنین کون تھا؟

☆ یاجوج ماجوج کون ہیں؟

☆ ذوالقرنین کی تعمیر کردہ سدذوالقرنین کب تعمیر ہوئی؟

☆ سدذوالقرنین کہاں واقع ہے؟

☆ سدذوالقرنین کا ختم نبوت سے کیا تعلق ہے؟

☆ کون سی قوم یاجوج ماجوج سے روابط رکھتی رہی ہے؟

یہ اور اس طرح کے دیگر چبھتے سوالات کے جوابات کے ساتھ

حکمت بالغہ کی ایک اور خصوصی اشاعت

یاجوج ماجوج نمبر

شائع ہوگئی ہے

صفحات:152 قیمت-/120روپے

مکتبہ قرآن اکیڈمی جھنگ

زیر انتظام انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر2،ٹوبہ روڈ جھنگ 047-7628561

(ادارہ)

وہن کا نتیجہ

شعائر اسلام کی توہین اور مسلمانوں کی اہانت

عن ثوبان h قال قال رسول اللّٰہ ﷺ :

((یُوْشَکُ الْاُمَمُ اَنْ تُدَاعٰی عَلَیْکُمْ کَمَا تُدَاعَی الْاَکَلَۃُ اِلٰی قَصْعَتِھَا)) فَقَالَ قَائِلٌ: وَ مِنْ قِلَّۃٍ نَحْنُ یَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: ((بَلْ اَنْتُمْ یَوْمَئِذٍ کَثِیْرٌ وَ لٰکِنَّکُمْ غُثَاءٌ کَغُثَاءِ السَّیْلِ وَ لَیَنْزِعَنَّ اللّٰہُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّکُمُ الْمَھَابَۃَ مِنْکُمْ وَ لَیَقْذِفَنَّ اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِکُمُ الْوَھْنَ)) فَقَالَ قَائِلٌ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَ مَا الْوَھْنُ؟ قَالَ: ((حُبُّ الدُّنْیَا وَ کَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ)) (رواہ ابوداؤد)

حضرت ثوبان h فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قریب ہے کہ دنیا کی اقوام کو تمہارے خلاف دعوت دی جائے گی جیسے کھانے والوں کو کھانے (کے پیالے) کی طرف دعوت دی جاتی ہے (جیسے آج کل ولیمہ کی دعوت پر چڑھائی کر دیتے ہیں)۔ کسی نے پوچھا: کیا اس وقت ہماری قلّت کی وجہ سے ایسا ہوگا؟ فرمایا: نہیں بلکہ تم اس وقت کثرت میں ہوگے لیکن تم سیلاب کے اوپر چھائے ہوئے کوڑے کباڑ کی طرح ہوگے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت و رُعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں 'وہن' ڈال دے گا۔ کسی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہن کیا ہے؟ آپ ﷺ فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے بیزاری۔

مسند احمد کی ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں: **حُبُّکُمُ الدُّنْیَا وَ کَرَاھِیَتُکُمُ الْقِتَال** یعنی وہن یہ ہے کہ تمہارا دنیا سے محبت کرنا اور اللہ کی راہ میں قتال کو ناپسند کرنا۔